اشرف السیر
فقیہ الہند حضرت علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی شارح بخاری
دامت برکاتہم العالیہ صدر شعبۂ افتاء جامعہ اشرفیہ مبارکپور
ناشر
دائرۃ البرکات
کریم الدین پور، برکات نگر، قصبہ گھوسی ضلع مئو (یوپی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا معتبر مستند مبسوط صحیفہ

فقیہ اعظم ہند حضرت علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی شارح بخاری

دامت برکاتہم القدسیہ صدر شعبہ افتا جامعہ اشرفیہ مبارکپور

ناشر

دائرۃ البرکات

کریم الدین پور۔ برکات نگر۔ گھوسی ضلع مئو

نام کتاب ـــــــ اَشرَفُ السِّیَر

نام مصنف ـــــــ فقیہ اعظم ہند شارح بخاری حضرت علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی دامت برکاتہم القدسیہ

تصحیح ـــــــ مفتی نسیم احمد مصباحی، مولانا نفیس احمد مصباحی اساتذہ جامعہ اشرفیہ۔ مبارک پور اعظم گڑھ

بار ـــــــ دوم

تعداد ـــــــ گیارہ سو (۱۱۰۰)

صفحہ ـــــــ ۲۳۲

قیمت ـــــــ

سنہ طباعت ـــــــ شعبان ۱۴۲۰ھ۔ نومبر ۱۹۹۹ء

ناشر ـــــــ دائرۃ البرکات محلہ کریم الدین پور قصبہ گھوسی ضلع مئو۔ پن کوڈ ۲۷۵۳۰۴

ملنے کے پتے

اہلسنت کے ہر کتب خانے سے مل سکتی ہے

المجمع الاسلامی مبارک پور، اعظم گڑھ	رضوی کتاب گھر ۴۲۳ مٹیا محل جامع مسجد دہلی ۶
المجمع المصباحی مبارک پور۔ اعظم گڑھ	فاروقیہ بک ڈپو، ۴۲۲/۲ مٹیا محل جامع مسجد دہلی ۶
حق اکیڈمی ۔ مبارک پور۔ اعظم گڑھ	مکتبہ جام نور ۴۲۲/۲ مٹیا محل جامع مسجد دہلی ۶
مکتبہ نور۔ نور اللہ روڈ الہ آباد	قادری کتاب گھر اسلامیہ مارکیٹ بریلی شریف
نیو سلور بک ایجنسی محمد علی بلڈنگ بھنڈی بازار بمبئی ۳	کتب خانہ امجدیہ، گاندھی نگر شہر بستی
	مکتبہ نعیمیہ مٹیا محل جامع مسجد دہلی ۶

برائے ایصال ثواب

فخر قوم وملت عالی جناب الحاج سیٹھ

شیخ بھلن صاحب مرحوم ومغفور
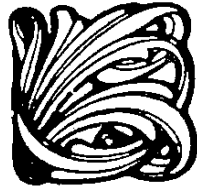
منجانب

معاون قوم وملت جناب الحاج سیٹھ

محمد الیاس صاحب زید مجدھم

گوپی گنج۔ ضلع بھدوہی۔ یوپی ہند

نذرانہ عبدیت

الٰہ العٰلمین

ایک بندۂ بے مایہ ”تیری بارگاہ میں“ تیرے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ذکر پاک کی نذرلے کر حاضر ہے۔ آس و یاس کی کشمکش سے دل دھڑک رہا ہے۔ آنکھیں پُرنم ہیں مگر پھر بھی تیرے کرم سے قبول کی امید ہے۔ وَاَنْتَ لِمَا اَمَّلْتُ فِیْكَ جَدِیْرٌ

برمن منگر برکرم خویش نگر

بندۂ عاجز

محمد شریف الحق امجدی

یوم جمعہ: ۲۷ محرم الحرام

۱۳۸۸ھ

دیباچہ طبع اوّل

اردو میں سیرپاک پر مبسوط اور مختصر ہر قسم کی متعدد کتابیں موجود ہوتے ہوئے بھی اس کتاب کی ضرورت تھی یا نہیں اس کتاب کو پڑھنے کے بعد یہ فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔ سیرپاک پر ایک مبسوط کتاب لکھنے کے لئے جتنا سکون اور وقت درکار ہے وہ مجھے میسر نہ آسکا اس لئے میں خود اپنے ذوق کے مطابق اسے مکمل اور آراستہ نہ کرسکا۔ اطمینان خاطر کے انتظار میں برسہابرس گزر گئے۔ آخر مایوس ہو کر جس حال میں تھا اسی حال میں لکھتا گیا۔ میری منتشر معلومات کا مجموعہ ناظرین کے سامنے ہے۔

وقت کی ایک اہم ضرورت پوری کرنے میں کس حد تک میں کامیاب ہوا یہ میں نہیں جانتا۔ لیکن پھر بھی میں اپنی جگہ مطمئن ہوں۔

ع شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

اس کتاب کی چار جلدیں ہیں اور ہر جلد تقریباً ڈھائی سو صفحات کی ہیں۔ آپ کے ہاتھوں میں اس کا ابتدائی حصہ ہے۔ سرمایہ کی کمی کی وجہ سے پوری جلد نہیں چھپ سکی۔ اگر ناظرین کا تعاون میرے شامل حال رہا تو بہت جلد بقیہ جلدیں منظر عام پر آجائیں گی۔ بھول چوک انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ ناظرین کو اگر کہیں کوئی غلطی ملے تو براہ کرم مجھے مطلع کریں۔

محمد شریف الحق امجدی
جامعہ عربیہ انوار القرآن
بلرام پور ضلع گونڈہ

جمعہ
۲۷ر محرم الحرام ۱۳۸۸ھ
۲۶ر اپریل ۱۹۶۸ء

دیباچہ طبع ثانی

اشرف السیر کا ابتدائی کچھ حصہ ۲۷ر محرم الحرام ۱۳۸۸ھ مطابق ۲۶ر اپریل ۱۹۶۸ء کو ۳۲ر سال پہلے انتہائی نامساعد حالات میں چھپا تھا اور اب تکمیل شرح بخاری کی تقریب کے موقع پر احباب کے اصرار بے حد پر دوبارہ پریس بھیج رہا ہوں۔

نظر ثانی کرتے وقت بہت سے ابحاث کا اضافہ ضروری محسوس ہوا مگر وقت کی قلت کی وجہ سے یہ اضافے نہ ہو سکے البتہ کہیں کہیں معمولی ترمیم یا کچھ زیادتی کر دی گئی ہے۔

اشرف السیر کی تکمیل یقیناً آج کل کے حالات کے پیش نظر ضروری ہے لیکن اب میرے سارے قویٰ جواب دے چکے ہیں اس لئے اب معذور ہوں۔ اللہ عزوجل کسی کو توفیق عطا فرمائے وہ اسے مکمل کر دیں تو مجھ پر اور مسلمانوں پر بہت بڑا احسان ہوگا۔

محمد شریف الحق امجدی
جامعہ اشرفیہ۔ مبارک پور

۹ر صفر ۱۴۲۰ھ مطابق ۲۵ر مئی ۱۹۹۹ء

پیش لفظ

از:۔ مولانا یسین اختر مصباحی

اردو زبان میں سرکار دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا بسوط و مستند ذخیرہ جمع کرنے اور تحقیقی و مفصل کتاب لکھنے کی نیت سے شارح بخاری نے آج سے تقریباً ۳۵ سال پہلے "اشرف السیر" کے نام سے اپنے کام کا آغاز کیا۔ اچھا خاصا ابتدائی مواد بھی جمع ہو گیا۔ مگر حالات نے اجازت نہ دی کہ آپ اس عظیم و جلیل خدمت کا سلسلہ جاری رکھ سکیں۔ جلد اول کا صرف نصف حصہ دو سو بتیس ۲۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ جو قسط اول کے طور پر ۱۹۶۸ء میں شائع ہو سکا لیکن جتنا جو کچھ شائع ہو سکا ہے وہی اس حقیقت کا غماز ہے کہ اگر اشرف السیر کی تکمیل ہو جائے تو نزہۃ القاری کی طرح اسے بھی قبول عام کا درجہ مل جائے گا۔ عزیز گرامی قدر مولانا عبدالحق رضوی نے خوشخبری سنائی ہے کہ نو جلدوں میں نزہۃ القاری شرح بخاری کا کام چونکہ مکمل ہو چکا ہے اس لئے اب حضرت شارح بخاری مدظلہ العالی "اشرف السیر" کی تکمیل میں کچھ ہی دنوں بعد ہمہ تن مصروف ہونے والے ہیں۔

اشرف السیر کا اسلوب تحریر اور انداز ترتیب نہایت فاضلانہ و مورخانہ ہے اور محققانہ بھی علم راسخ اور عشق رسول کی، سطر سطر میں آمیزش ہے۔

کتاب کی تمہید میں سیرت نگاری کی ابتدا اور اس کی ترقی، قدیم سیرت نگار اور جدید مورخین مستشرقین کے مہمل اعتراضات سے مرعوب جدید مصنفین اور ان کا کردار اور ان سب کی روشنی میں سیرت النبی کے موضوع پر اردو زبان میں ایک جامع اشرف السیر کی ترتیب زیر نظر اشرف السیر کا سبب تالیف ہے۔

شارح بخاری نے تحریر کیا ہے کہ "محمد بن اسحق، محمد بن عمر واقدی، محمد بن

سعد، محب الدین ابن جریر طبری یہ سیرت کے قدیم مؤرخین ہیں۔ اور سیرت پر ترتیب دی ہوئی ان کی کتابیں سیر ومغازی کی بنیاد ہیں جو سارے عالم اسلام کے اندر معروف ومشہور ہیں۔

مذکورہ حضرات پر کچھ لوگوں نے نقد وجرح کی جو روایتیں نقل کی ہیں ان کا شارح بخاری نے مفصل جواب دے کر انھیں ثقہ، عادل، معتمد قرار دیا ہے۔ اور شکوک وشبہات کے مصنوعی گھروندے کو خود اپنی نقد وجرح کے ذریعہ بکھیر دیا ہے ضعیف اور موضوع کا فرق بتلا کر نقلی وعقلی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ سیر ومغازی میں موضوع کے علاوہ ہر قسم کی روایت مقبول ہے۔ پھر اصطلاح حدیث کی کچھ تفصیلات درج کی ہیں۔ بحث کے آخر میں تحریر فرماتے ہیں۔

۱ ـــــــ سیر ومغازی فضائل ومناقب کے وہ ابواب جو قطعی نہیں ان میں علاوہ موضوع کے ہر حدیث وروایت مستند ہے، اسی پر تمام امت اور علمائے سیر ومغازی کا عمل ہے

۲ ـــــــ عقائد واحکام میں البتہ موضوعات کے ساتھ ضعاف بھی غیر معتمد ہیں۔ اگرچہ وہ سیر وفضائل کا جزء ہوں۔

۳ ـــــــ جب تک علمائے معتمدین ومحتاطین جن پر امت کو اطمینان ہے، یہ تصریح نہ کریں کہ یہ حدیث موضوع یا ضعیف ہے۔ کسی غیر محتاط متغالی کے موضوع کہہ دینے سے حدیث موضوع نہ ہوگی۔

۴ ـــــــ کسی حدیث یا روایت پر کسی محدث کا طعن اسکے ساقط الاعتبار ہونے کے لئے کافی نہیں۔ جب تک کہ اس کی مکمل چھان بین نہ ہو جائے۔

۵ ـــــــ لا یصح، لایثبت۔ صحیح نہیں، ثابت نہیں مجہول ہے۔ شاذ ہے، منکر ہے منقطع ہے، مرسل ہے، مدلس ہے معضل ہے مضطرب ہے، مدرج ہے معلل ہے، غریب ہے، اس قسم کی اور جرحیں سیر ومغازی، فضائل ومناقب میں مستند ہونے میں مخل نہیں، بلکہ ان میں سے

بعض احکام میں بھی معتمد ہیں۔

۶ــــــــ ہاں! تعارض کے وقت کتاب اللہ پھر احادیث، صحاح حسان کو ہمیشہ ترجیح ہوگی۔

۷ــــــــ روایت مقبولہ کے ہوتے ہوئے محض اپنی رائے اور قیاس سے مزاحم ہونے کی وجہ سے کسی مروی کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ ہماری عقل خواہ کتنا ہی اِبا کرے۔

رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا نسب نامہ بیان کر کے شارح بخاری لکھتے ہیں۔ عدنان تک سلسلہ نسب متفق علیہ ہے، اس لئے علمائے محتاطین نے اسی پر اکتفا فرمایا۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنا نسب نامہ عدنان تک بیان فرما کر خاموش ہو جاتے۔ حضرت عمر فرماتے ہیں کہ مجھے کوئی ایسا نہیں ملتا جو عدنان کے آگے سلسلۂ نسب جانتا ہو۔

علمائے انساب کا اس پر اتفاق ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آبا واجداد میں عدنان کے آگے حضرت اسمٰعیل، حضرت ابراہیم، حضرت نوح حضرت ادریس، حضرت شیث بالضرور ہیں۔

حضرت ابراہیم و حضرت اسمٰعیل کی مکہ مکرمہ میں تشریف آوری بنی جرہم کی آمد، خانہ کعبہ کی تعمیر، حضرت اسمٰعیل کی سکونت کے بیان کے بعد اس امر کی تفصیلی تحقیق کی حضرت اسمٰعیل ہی ذبیح اللہ ہیں۔ قبائل عرب اور ان کی مختلف شاخوں کا بھی ذکر ہے۔ عہد عبدالمطلب میں چاہ زمزم کی دوبارہ کھدائی اور حضرت عبداللہ کی ولادت اور اس کے متعلق واقعات ہیں۔ سنت ابراہیم کی تجدید، حضرت آمنہ سے حضرت عبداللہ کا نکاح، اصحاب فیل کی تباہی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت طیبہ اور رضاعت پھر کتاب کے آخر میں آپ کے والدین کریمین کے بارے میں اس بات کا مستند ثبوت کہ وہ اور ان کے آبائے کرام کفر و شرک اور ہر طرح کی بدکاری اور بے حیائی سے پاک تھے۔ اپنے

زمانہ کے افضل ترین لوگ تھے۔ صاحب اسلام تھے۔

(خورشید رسالت کا طلوع) کے عنوان سے شارح بخاری نے جس والہانہ انداز سے ولادت طیبہ کے احوال وواقعات کا آغاز کیا ہے۔ اسی پر ان سطور کا اختتام کیا جارہا ہے۔ یہ اقتباس ایک ادبی شہ پارہ بھی ہے۔

"آج بہار خلد وادی تہامہ میں اتر آئی ہے۔ آسمان اپنی انجمن کے ساتھ دولت سرائے آمنہ پر جھکا آرہا ہے۔ ماہتاب وسط آسمان پر فضائے بسیط پر اپنی نقرئی چاندنی تانے ہوئے ہے۔ آفتاب بڑی تیزی سے افق مکہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ جبریل آمین ملاء اعلیٰ کے نورانی انفاس کی فوج در فوج جلو میں لے کر دست بستہ کاشانۂ عبداللہ پر کھڑے ہیں۔ کارکنان قضاوقدر چشم براہ ہیں۔ ملکہ مصر آسیہ، کنواری بتول مریم، حوران بہشت کے ساتھ حاضر ہیں۔

کیوں اس لئے کہ۔

نور ازل کا آئینہ جمال وکمال قادر مطلق کا مظہر ذات وصفات، رب العٰلمین کا خلیفۂ اعظم، خالق کونین کا نائب اکبر، خزائن السمٰوٰت والارض کا مالک، نعمہائے الٰہیہ کا قاسم، ملکوت وملک کا تاجدار، بحروبر کا مختار، سیدالمرسلین خاتم النبیین رحمۃ للعٰلمین، شفیع المذنبین دعائے خلیل، تمنائے کلیم، بشارت مسیح، جگر گوشہ عبداللہ، نور دیدہ آمنہ، رونق افزائے عالم شہود ہونے والا ہے۔

یٰسین اختر مصباحی

بانی دارالقلم نئی دہلی

مدیر ماہنامہ کنزالایمان نئی دہلی

۲؍ ربیع النور ۱۴۲۰ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ المجید الاجمد العلی الاعلیٰ۔ والصلوٰۃ و السلام علیٰ احمد رضا سیدنا محمد ن المصطفیٰ وعلیٰ آلہٖ سفینۃ النجاۃ وصحبہ نجوم الھدیٰ:

عقل اگرچہ انسان کا جوہر کامل اور مکمل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر انسان اپنی عقل کے کمال کو دوسرے قوائے بہیمیہ پر غالب رکھے تو پھر انسان کہیں بھٹک نہیں سکتا ہے اور نہ ٹھوکر کھا سکتا ہے۔ مگر افسوس یہی ہے کہ انسان کا یہ جوہر اعلیٰ اس کے دوسرے قویٰ کی شہوات بد سے اکثر دب جاتا ہے اور اس کا جوہر ذاتی مغلوب ہو کر بالکل ناکارہ ہو جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ عقل جو انسان کو مدارج ترقی طے کرانے کا آلہ کامیاب تھی اس کی تباہی و بربادی کا زبردست وسیلہ ہو جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دنیا میں جو بھی خرابی پیدا ہوئی یا ہوتی ہے یا ہوگی وہ سب کی سب اسی عقل مغلوب کی رہین نحوست ہے۔ انسان نے جب کبھی ٹھوکر کھائی تو اسی وجہ سے کہ اس کی عقل کے کمال میں کمی یا کجی تھی۔

یہی عقل مغلوبہ تھی جس نے نمرود کو بابل کی حکومت پر خدائی کا دعویٰ کرنا سکھایا تھا۔ یہی عقل مغلوبہ تھی جس نے مصر کے جاہ و حشم کو اپنی مٹھی میں دیکھ کر فرعون کو اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی کہنے پر ابھارا تھا۔ یہی عقل مغلوبہ تھی جس نے سامری کو سونے چاندی کے مجسمہ میں بچھڑے کی طرح بولنے کی قوت پیدا کرنے کا طریقہ سکھایا تھا۔ یہی عقل مغلوبہ تھی جس نے یہودیوں کو حضرت

عزیر پر اور عیسائیوں کو حضرت مسیح پر ابن اللہ ہونے کا فریب دیا تھا۔ یہی عقل مغلوبہ تھی جس نے توریت و انجیل کو مسخ کرایا اور انسان کی پیشانی کو معبود برحق کی بارگاہ سے ہٹا کر صلیب اور بت کے سامنے جھکایا۔

قدرت کا فضل

اس لئے ضرورت تھی کہ انسان کے اس جوہر اعلیٰ کی حفاظت کے لئے بھی اور تکمیل تربیت کے لئے بھی کوئی ایسا انتظام ہوتا کہ قوائے بہیمیہ اس کے علو میں انحطاط اور کمال میں زوال نہ پیدا کر سکیں۔ اور نہ اس کی ترقی میں سدّ راہ ہو سکیں۔ انسان اگر خود انتظام کرتا تو خطرہ تھا کہ کہیں اس میں بھی قوائے بہیمیہ نے اپنے دخیل ہونے کی گنجائش باقی رکھی ہو۔ اس لئے اس ذات ارحم الراحمین کریم وجواد نے خود اپنے فضل و کرم سے اپنی عطا فرمودہ اس نعمت عظمیٰ کی حفاظت کے لئے اس کی اصلاح و تربیت کیلئے اپنے ان بندگانِ خاص کو مبعوث فرمایا جو شکل میں انسان ہی کے ہوتے ہیں، کھاتے بھی ہیں پیتے بھی ہیں۔ بازاروں میں چلتے پھرتے بھی ہیں مگر حقیقت میں ان کا حریم اس قدر بلند ہے جہاں مَلَکِ مقرب کی بھی رسائی نہیں ہوتی۔ جن کا ایک تعلق ہم سے اور تم سے ہوتا ہے اور ایک تعلق اس ذات مالک الملک سے ہوتا ہے جن کی عقل کے کمال پر ذات بحت کی تجلیاں پرتو افگن ہوتی ہیں۔ اور اس کے غلبہ کو اس کا جبروت فیض بخش ہوتا ہے۔ دوسرے قوی ہوتے تو ضرور ہیں مگر ان کی فعالی قوت کے تمام ارادے محکوم اور معصوم ہوتے ہیں انھیں نفوس قدسیہ کو زبان شرع میں انبیا کہا جاتا ہے۔

علی سید هم وعلیهم الصّلوٰة والسّلام

انبیاے سابقین

اگلے انبیا علیہم السلام کی بعثت اور انکی کتاب و حکمت کا تعلق کسی مخصوص قوم سے ہوا کرتا تھا۔ اسلئے ان کی تعلیم میں اس قوم کی خصوصیات کے لحاظ سے کچھ مخصوص جوہر کی

تابش ہوا کرتی تھی اور ان کی میعاد بھی زمانے کے اعتبار سے بھی اور مکان کے اعتبار سے بھی محدود ہوا کرتی تھی یہی سبب ہے کہ علیٰحدہ علیٰحدہ خطہ زمین کے لئے علیٰحدہ علیٰحدہ پیغمبر کی حاجت ہوئی چنانچہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ حضرت لوط کے ہوتے ہوئے بھی حضرت ابراہیم کا حلم ورحمت سایہ گستر تھا اور حضرت شعیب کے زمانہ ہی میں حضرت موسیٰ کے جلال وجبروت کی ضرورت ہوئی اور پھر جب یہ تشریف لے گئے تو سلیمان و داؤد کی خلافت اور حضرت روح اللہ کی مسیحائی کی دنیا محتاج ہو گئی۔ عَلَيْهِمُ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَام

ایک جامع کامل کی ضرورت

یہ تمام آنے والے آئے اور چلے گئے، کیونکہ یہ اسی لئے آئے تھے کہ اپنے کام کی تکمیل کے بعد چلے جائیں یہ بھی تشریف لے گئے اور ان کے ساتھ ہی ان کی تعلیمات بھی منسوخ ہو گئیں مگر ابھی نہ زمین فنا ہوئی تھی اور نہ اس کے بسنے والے۔ اور نہ ان کے روحانی اور جسمانی حوائج منقطع ہوئے تھے۔ اور جس طرح دنیا کو اللہ کی زمین اور اس کے لامتناہی خزائن اس کے آسمان اور اس کے شمس وقمر کی احتیاج باقی تھی اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ اللہ کے نبی اللہ کی کتاب اور اس کی تعلیم وحکمت کی حاجت تھی مگر اب دنیا محض نوح ویونس کی عبادت وشکر پر قانع نہیں رہ سکتی تھی۔ کیونکہ وہ اب ابراہیم کے حلم ورافت سے بھی لذت آشنا ہو چکی تھی۔ اب صرف یعقوب ویوسف کا صبر وصداقت حسن ومحبت دنیا کو اپنی طرف مائل نہیں رکھ سکتا تھا۔ کہ وہ داؤد وسلیمان کی خلافت کے جاہ وحشم بھی دیکھ چکی ہے۔ اب صرف موسیٰ کا جاہ وجلال دلوں کو نرم نہیں رکھ سکتا تھا۔ کیونکہ وہ حضرت مسیح کے عفو وصفح زہد وورع کی مومیائی سے بھی لذت یاب ہو چکی ہے۔ اس لئے یہ تمام عالم کون وفساد بے چین تھا۔ اس کامل ہستی اور جامع وجود کے لئے جو زیب تخت وتاج ہونے کے ساتھ ہی ساتھ زینت سجادۂ خلوت

بھی ہو، جس کے عفوو رحمت میں تمام عالم پناہ لے اور جلال و ہیبت سے قیصر وکسریٰ اپنے محل میں لرز اٹھیں۔ جن کا عفوو صفح عام ہو۔ اور جلال وجبروت ہیبت آگیں جو رحمۃ للعٰلمین بھی ہو اور اشد علی الکفار والمنافقین بھی ہو جس کی نظر رحمت حیات بخش بھی ہو اور نگاہ قہر جانستان بھی ہو۔ اسی ذات کامل کا نام ہے محمد مصطفیٰ۔ اسی وجود جامع کو کہتے ہیں احمد مجتبیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تسلیماً کثیراً کثیراً

سیرت کی ضرورت اور اس کی تالیف

چونکہ اس جامع اکمل کی رسالت کا تعلق نہ صرف مخصوص لوگوں سے تھا اور نہ اس کی تعلیم کی میعاد محدود تھی بلکہ تمام عالم کے لئے سب سے آخری مقتدیٰ تھا۔ اور اس کی تعلیم بھی قیامت تک کے لئے غیر متبدل اور غیر مختتم قانون تھی۔ اس لئے خود اس ہادی کامل نے اپنے حلقہ بگوشوں پر تمام فرائض سے اہم یہ فرض مقرر فرمایا کہ وہ کتاب اللہ کے ساتھ ہی ساتھ ان کے اقوال کے ایک ایک حرف کا ان کے افعال کی ہر ہر ادا کا اس کے حلیہ وجود کے ہر ہر نقش ونگار کا ایک کامل سراپا تیار کریں۔ جو اس کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد بھی منارۂ رشد وہدایت ہو۔

صحابۂ کرام نے پھر تابعین اور تبع تابعین نے پھر علمائے ملت نے اپنے اس فرض کو جس حسن وکمال کے ساتھ انجام دیا۔ وہ اتنا عظیم الشان ہے کہ جس پر آج کا ترقی یافتہ دور بھی انگشت بدندان ہے۔

سیرت نگاری کی ابتدا اور اس کی ترقی

احادیث کریمہ کے قلمبند کرنے کی داغ بیل تو عہد رسالت ہی میں پڑ چکی تھی۔ اس سلسلہ میں سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی جمع فرمودہ احادیث

خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ خطیب کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی کچھ احادیث قلم بند کی تھیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے عہد صحابہ میں اس پر کوئی ترقی نہیں ہوئی۔ احادیث کی اشاعت اگرچہ پورے اہتمام سے ہوئی مگر اس کا ذریعہ صرف زبانی روایت ہی تھا۔ عہد تابعین میں سیدنا عمر بن عبد العزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے احادیث کی تدوین کا کام بلند پیمانے پر شروع فرمایا۔ ابو بکر بن محمد بن عمر بن حزم انصاری اور سعد بن ابراہیم کو خاص طریقہ سے اس خدمت پر مقرر فرمایا۔ ان دونوں بزرگوں نے اس قابلِ فخر خدمت کو بڑی عمدگی سے انجام دیا۔ دفتر کی دفتر احادیث جمع کیں۔

عہد صحابہ میں عام احادیث کریمہ کی طرح واقعات سیر بھی سینہ بہ سینہ محفوظ تھے۔ یہ فخر بھی عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ کی ہی قسمت میں تھا کہ انھوں نے سیر کی بھی اشاعت کا مخصوص اہتمام کیا۔ عاصم بن قتادہ انصاری کو غزوات نبی کے درس پر متعین فرمایا۔ انھیں کے عہد میں محمد بن مسلم بن شہاب زہری نے سیر کی تدوین کا افتتاح کیا انھوں نے اس فن میں ایک مستقل کتاب لکھی اور خاص توجہ سے اس فن کی اشاعت میں مصروف رہے۔ یہ ابن شہاب زہری ہی کی برکت ہے کہ موسیٰ بن عقبہ اور محمد بن اسحٰق جیسے امام پیدا ہوئے جنھوں نے اس فن میں وہی درجہ حاصل کیا جو فن حدیث میں امام بخاری اور مسلم کا ہے۔ پھر ابن ہشام امام واقدی اور ان کے تلمیذ جلیل ابن سعد اور ابن جریر طبری جیسے کامل فن ائمہ سیر نے اس فن کی جو عظیم الشان اشاعت کی وہ انھیں اجلہ ائمہ کا حصہ تھا۔ چنانچہ آج یہ امر مسلم ہے کہ سیرت پر اگرچہ سیکڑوں کتابیں مدون ہوئیں مگر وہ سب کی سب انھیں ائمہ کی تصنیفات سے ماخوذ ہیں۔ سیر پاک کے ساتھ مسلمانوں کے ایمان کو جو وابستگی تھی اسکی وجہ سے مسلمانوں نے اس کی جتنی مہتم بالشان اشاعت کی اس کا اندازہ اس

سے لگایا جا سکتا ہے کہ آج بھی جب کہ مسلمان اپنا سب کھو چکے ہیں۔ ان کے پاس سیرت کا اتنا بڑا ذخیرہ موجود ہے جس پر تمام دنیا کی قومیں رشک کر رہی ہیں اور اس کی بقا اور دوام کا ایسا مکمل انتظام ہے کہ قیامت تک کوئی اسے فنا نہیں کر سکتا۔

سیرت پاک اور یورپ

اسی صاحب سیرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضل و تربیت کے سایہ میں مسلمانوں نے جب اپنا قدم آگے بڑھایا تو ان کے قدم میں وہ ثبات اور عزت تھی کہ دنیا کی کوئی طاقت ان کی سد راہ نہ ہو سکی۔

کسریٰ مزاحم ہوا تو وہ ٹکڑے ٹکڑے ہوا۔ قیصر مقابل ہوا تو اسے بھی سامنے سے بھاگنے ہی میں اپنی نجات نظر آئی۔ اور چند ہی دنوں میں دنیا کی تمام قوموں کو اسلام ہی کی آغوش رحمت میں اطمینان کی زندگی نصیب ہوئی۔ دنیا کے جس حصہ تک مسلمانوں نے اپنے آپ کو پہنچایا وہاں کے بسنے والوں نے ان کو جانا۔ اور پہچانا۔ اور ان کے وجود کی قدر کی۔ مگر وہ لوگ جو اپنی بدقسمتی سے مسلمانوں کے سایہ رحمت سے محروم رہے۔ وہ گھروں میں بیٹھے بیٹھے اپنے قسیسین اور رہبانوں کی زبانوں سے مسلمانوں کے متعلق عجیب و غریب کچھ وحشیانہ کچھ احمقانہ قصے سنتے رہے۔ انھوں نے مسلمانوں کو تو نہیں جانا! البتہ ان کے مخترعہ عجیب وجود سے باخبر ہوئے۔ انھیں بدقسمتوں میں سے یورپ بھی تھا...... یورپ نے مسلمانوں کو کیا سمجھا تھا۔ اسے ہنری دی کاستری فرانسی کی زبان سے سنئے۔

"ہر مسیحی شاعر مسلمانوں کو مشرک اور بت پرست سمجھتا تھا۔ اور حسب ترتیب درجات ان کے تین خدا تسلیم کئے جاتے تھے ماہوم یا ماہون، یا مافومیڈ (یعنی محامڈ) اور دوسرا اپلین۔ اور تیسرا ٹرگامان۔ ان کا خیال تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے مذہب

کی بنیاد دعوئ الوہیت پر قائم کی اور سب سے عجیب تر یہ ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) (وہ محمد جو بت شکن اور دشمن اصنام تھا) لوگوں کو اپنے طلائی بت کی پرستش کی دعوت دیتا تھا" از سیرت ص۸۱

جب سترہویں صدی کے قرون وسطی سے یورپ نے نئی کروٹ لی اور کچھ زمانہ کے بعد اپنے قسیسین اور رہبانیین کے پنجہ سے نجات حاصل کی۔ اور آزاد ہو کر اسلام اور بانئ اسلام کے حالات خود اہل اسلام کی زبانی سنا تو ان کو خود بھی اپنے اگلوں کے ان بے بنیاد توہمات پر حیرت ہوئی لیکن مذہب کا تعصب ایسا بینا نہ تھا کہ انھیں واقعات کی صحیح شکلیں نظر آجاتیں۔ انھوں نے بھی اگلی ذہنیت کے ماتحت جب اسلام کی صحیح تاریخ پڑھی تو ان کو بھی اس سے کچھ کم نہ سوجھا جو ان کے اگلوں کو سوجھا تھا۔ ان واقعی باتوں کا اعتراف ہنری وی کاستری کو خود بھی ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے۔

"وہ تمام قصص اور گیت جو اسلام کے متعلق یورپ میں قرون وسطی میں رائج تھے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ مسلمان ان کو سن کر کیا کہیں گے۔ یہ تمام داستانیں اور نظمیں مسلمانوں کے مذہب کی ناواقفیت کی وجہ سے بغض و عداوت سے بھری ہوئی ہیں۔ جو غلطیاں اور بدگمانیاں اسلام کے متعلق آج تک قائم ہیں۔ ان کا باعث وہی قدیم معلومات ہیں" (از سیرت ص۸۱)

اسی مسموم ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ وہ اوصاف جو انسانیت کیلئے باعث کمال ہیں۔ جب اسلام اور بانئ اسلام میں انھیں نظر آئے تو اسلام کے کامل مذہب ہونے اور بانئ اسلام کے باکمال ہونے کا اعتراف کرنے کے بجائے جوش تعصب میں الٹے ان سے بانئ اسلام کے عیوب کی فہرست تیار کرتے ہیں شبلی صاحب تو شبلی صاحب اگر تمام دنیا ان متعصبین کو معذور رکھنے پر مصر ہو تو بھی ہم معذور نہیں سمجھ سکتے۔ مدعی بینائی ہوتے ہوئے آفتاب کو

داغدار بتانا لائق درگزرنہیں ہوسکتا۔ یورپ کے مستشرقین کا یہ جرم ایسا جرم ہے جو قیامت تک ان کے فہم و دانش پر بدنما دھبہ بن کر رہے گا۔

یورپ کی کدورت دنیائے اسلام میں

یورپ کی اس گندگی کی رَو ایسی سست نہ تھی جسے وہ مسلمان روک سکتے تھے جنھیں صدیوں کا عیش و تنعم تھپکیاں دے رہا تھا۔ اس طوفان کا رخ جب غافل مسلمانوں کی طرف ہوا تو دیکھتے ہی دیکھتے مسلمان اس طرح بہ گئے جیسے زمین پر پڑے ہوئے تنکے حکومت چلی گئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ نقصان بھی ناقابلِ برداشت تھا مگر ہمارے قلب کی ایک ایک دھڑکن ٹیس بن کر ہمارے رگ و ریشہ میں پیوست ہو رہی ہے جب ہم یہ دیکھنے کے لئے زندہ ہیں کہ ہمارے مذہبی عمران کو یورپ کا مکر و کید خود ہمارے ہی ہاتھوں ہمارے ہی مہیا کردہ اسباب سے تباہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

سیرت کی نئی تصنیفات

یورپین مورخین نے سیرت نبوی پر جو اعتراضات کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

۱ـــــ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زندگی مکہ معظمہ تک پیغمبرانہ تھی لیکن مدینہ جا کر جب زور اور قوت حاصل ہوئی تو دفعتہً بادشاہی سے بدل گئی جس کی دلیل لوازم بادشاہی، لشکرکشی، خوں ریزی، انتقام وغیرہ ہیں۔

۲ـــــ دنیاداروں کی سی حکمت عملی اور بہانہ جوئی۔

۳ـــــ مذہب کی اشاعت پر جبر و قہر۔

۴ـــــ لونڈی غلام بنانے کی اجازت اور اس پر عمل۔

۵ـــــ کثرتِ ازواج۔

ان اعتراضات کی مستشرقین نے جو کریہہ تصویر کھینچی ہے وہ صرف ایک

مسلمان کے لئے ہی ناقابلِ برداشت نہیں بلکہ ہر انصاف پسند محقق کی نظر میں قابلِ نفریں ہے۔ یورپ کی ایسی کتابوں کے مطالعہ کے بعد بعض لوگوں نے بنام مسلمان سیرت پر قلم اٹھایا۔ اور اپنا مطمح نظر سب سے زیادہ مستشرقین کے ان اعتراض کا دندان شکن جواب دینا بتایا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ملت کا ایک اہم فریضہ تھا اس طرف جو قدم بھی اٹھایا جاتا، وہ آنکھوں سے لگانے کے قابل تھا۔ لیکن ہمیں افسوس اس امر کا ہے کہ ان اعتراضات کے جواب دینے والے جواب دیتے وقت اس قدر مرعوب ہو جاتے ہیں کہ بجائے جواب دینے کے مسلّم الثبوت واقعاتِ سِیَر کا سرے سے انکار کر دیتے ہیں۔ بلکہ کہیں کہیں ایسے بے اختیار یا بد حواس ہو جاتے ہیں کہ ان کی تحقیقات کی رُو میں سارے فنِ سیرت کی بنیاد کھوکھلی ہو جاتی ہے جس کی بکثرت مثالیں اپنے مواقع پر ملیں گی۔ یہاں صرف دو مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔

ا ـــــ بحیرا راہب کا واقعہ کتب سیر کے علاوہ صحاح ستہ کی کتابوں میں بھی موجود ہے کہ حضور جب ابو طالب کے ساتھ شام کو بغرض تجارت تشریف لے جا رہے تھے تو راستہ میں بحیرا راہب نے آنحضور میں آثار نبوت دیکھ کر آنحضور اور تمام قافلہ والوں کو اپنے کنیسہ میں مدعو کیا اور ابو طالب کو مشورہ دیا کہ انھیں شام نہ لیجائیں یہود کی حاسد و مبغض طبیعت سے خطرہ ہے۔ انھیں مکہ واپس کر دیں چنانچہ ابو طالب نے حضور کو مکہ واپس کر دیا۔

یورپ نے اس پر یہ تک بندی کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت محمد عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اسرارِ مذہب اسی عیسائی راہب سے سیکھتے تھے یہ عیسائیت کی اسلام پر فتح ہے۔

جدید مصنفین نے یہ جواب دیا کہ یہ واقعہ سرے سے بے بنیاد ہے۔ اسے ثابت کرنے کے لئے اجلہ محدثین پر وہ طعن و تشنیع کی ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔

۲ ـــــ کتب سیر کے علاوہ کتبِ حدیث میں بھی غزوۂ بدر کا سبب یہ مذکور ہے کہ قریش کا ایک تجارتی قافلہ ابوسفیان کی سرکردگی میں شام سے مکہ واپس جارہا تھا نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خبر ہوئی۔ آپ اس قافلہ کی نیت سے مدینہ سے باہر تشریف لائے۔ ابوسفیان کو پہلے ہی سے خطرہ تھا۔ اس نے مکہ آدمی بھیج کر ایک لشکر جرار منگالیا اور بدر کے میدان میں معرکہ ہوا۔

مستشرقین نے اس پر اعتراض کیا۔ یہ ڈاکہ زنی ہوئی۔ اور نبی کی شان ڈاکہ زنی نہیں۔

ان محققین نے جواب دیا کہ سرے سے یہی غلط ہے کہ "غزوۂ بدر میں آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس قافلہ کی نیت سے نکلے تھے"۔ یہ تو میں اُس کی جگہ بتاؤں گا کہ بحیرا راہب کا واقعہ کسی طرح بھی عیسائیت کی اسلام پر فتح نہیں ہوسکتا۔ بلکہ درحقیقت اسلام کی عیسائیت پر فتح مبین ہے اس واقعہ کو تسلیم کر لینے کے بعد عیسائیوں کو سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ اسلام کے دامن سے وابستہ ہوجائیں۔ قریش نے حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور صحابہ کے ساتھ جو کچھ کیا تھا اور آئندہ جو کچھ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے خود یہ قافلہ جس مقصد کے پیشِ نظر شام گیا تھا اس کو سامنے رکھ کر حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا یہ اقدام ڈاکہ زنی نہیں۔ حفاظتِ خود اختیاری، استیصالِ فساد اور قیام امن کا سنگ بنیاد ہے۔

مجھے یہاں یہ بتانا ہے کہ یہ حقائق ان محققین کے مرعوبانہ انکار سے ہرگز ہرگز بے اصل نہیں ہوسکتے اور نہ مستشرقین نے جو مہمل اعتراضات کیے ہیں ان کا جواب یہ ہے کہ سچی بات کو جھوٹی کہی جائے بلکہ معترضین نے ان کی تصویر کشی میں جو خیانتیں کی تھیں ان کو بے نقاب کر دیا جائے اور بس جدید مصنفین کے طرز عمل نے ایک نیا سوال کھڑا کر دیا کہ ان کے رویہ نے بتا دیا کہ حضور

سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سیرت پاک کے جس حصہ پر یورپین دریدہ دہنوں کا جو اعتراض ہے وہ اپنی جگہ درست ہے۔ سیرت پاک کا یہ جز ضرور ایسا ہی ہے جیسا کہ یورپین معترضین کہہ رہے ہیں۔ اب ہر منصف بتائے کہ آپ نے گندگی دور کی یا اس کو اور گھناؤنی کر دیا وہ تو غیر تھے ان کے لکھنے اور کہنے سے کیا ہوتا ہے؟ آپ تو اپنے بن کر غیروں کی تائید کر گئے اس طرح جو تسمہ لگا تھا آپ نے اسے بھی علیٰحدہ کر دیا۔

خون کے آنسو بہانے کے لئے یہی کیا کم تھا کہ آگے بڑھ کر فضائل و معجزات کی ہزار ہا احادیث کو بے اصل ثابت کرنے اور واقعاتِ سیر کی لاکھوں جزئیات کو جھٹلانے کے لئے ائمۂ محدثین پر ایسی متعصبانہ یک طرفہ تنقیدیں کی جاتی ہیں کہ جس کے بعد کتبِ احادیث و سیر کا درجہ داستانِ الف لیلہ و طلسم ہوشربا کے ہم پلہ ہو جاتا ہے۔ اپنے مطلب کی باتیں ثابت کرنی ہوتی ہیں تو صرف بخاری و مسلم تک نظر محدود نہیں رہتی۔ بلکہ ابن تیمیہ اور ابن قیم کے تہورات و خرافات بھی مستند ہو جاتے ہیں اور جہاں حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فضائل و معجزات کی باری آتی ہے تو امام احمد بن حنبل، امام ابو عبد اللہ حاکم، امام قاضی عیاض، ابو نعیم، ابن ابی شیبہ، علامہ جلال الدین سیوطی، علامہ ابن حجر عسقلانی، علامہ احمد خطیب قسطلانی، شیخ محقق عبد الحق دہلوی جیسے اساطینِ ملت غیر مستند ہو جاتے ہیں۔ جس کی صدہا مثالیں آئندہ ملیں گی۔ یہاں بقدرِ نصابِ شہادت صرف دو مثالوں پر اختصار کرتا ہوں۔

۱۔ امام حاکم نے مستدرک میں یہ حدیث روایت کی ہے۔ جب حضرت آدم سے لغزش ہو گئی تو انھوں نے شفیع اعظم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے وسیلہ سے مغفرت چاہی۔ ارشاد ہوا۔ تم نے میرے محبوب کو کیسے جانا۔ حضرت آدم نے عرض کیا۔ میں نے عرش کے پایوں پر لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ لکھا دیکھا۔ اس سے میں نے جانا کہ جن کا نام تو نے اپنے

نام کے ساتھ عرش کے پایہ پر لکھا ہے۔ وہ یقیناً تیری بارگاہ میں محبوب ترین ہوں گے۔ ارشاد ہوا۔ آدم تم نے سچ کہا۔ اگر محمد نہ ہوتے تو تم کو بھی پیدا نہ کرتا۔

حاکم نے اس حدیث جلیل کی تصحیح کی۔ ابن تیمیہ نے اس پہ بے سروپا جرح کی۔

اما تصحیح الحاکم لمثل هذا الحدیث وامثالہ فهذا مما انکرہ علیہ ائمۃ العلم بالحدیث و قالوا ان الحاکم یصحح احادیث و هی موضوعۃ مکذوبۃ عند اهل المعرفۃ بالحدیث۔

حاکم کے اس قسم کی حدیثوں کو صحیح کہنے پر ائمہ حدیث نے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ بہت سی جھوٹی اور موضوع حدیثوں کو صحیح کہتے ہیں۔

ان بزرگوں نے اس جرح کو لے کر ایک طرف اس روایت کو موضوع کہدیا اور دوسری طرف امام حاکم کی پوری مستدرک کے اعتبار کا جنازہ نکال دیا۔

۲ ——— علاوہ کتب سیر کے حسب تخریج آنجناب، بیہقی، ابونعیم، خرائطی، ابن عساکر، ابن جریر نے یہ روایت کی ہے کہ وقتِ ولادت، ایوانِ کسریٰ میں زلزلہ پڑ گیا، آتشکدۂ فارس بجھ گیا، بحیرۂ طبریہ سوکھ گیا، مگر حضور والا نے اس روایت کو صرف اس بنا پر غیر معتبر کہہ دیا کہ بخاری و مسلم میں نہیں۔

دوسری طرف اسی ہندوستان میں ایک گروہ ایسا بھی پیدا ہو گیا ہے جو اللہ کے رسولوں کو گاؤں کے پدھان اور چودھری اور زمیندار کی طرح سمجھتا ہے۔ بلکہ ذرۂ ناچیز سے کمتر، چمار سے زیادہ ذلیل جانتا ہے۔ انکے علم سے شیطان کے علم کو وسیع کہتا ہے۔ حتیٰ کہ علمِ رسول کو بچوں، پاگلوں اور چوپایوں کے مثل بتاتا ہے۔ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا۔

سببِ تالیف

یہ تلخ حقائق ایسے نہیں جنھیں دیکھ کر خاموشی اختیار کی جاتی۔ بالآخر میں نے سیرت پاک پر ایک مکمل مفصل کتاب لکھنے کا ارادہ کر لیا۔

حقیقت میں تو یہ کام ان اکابرِ ملت کا تھا جو علم دین کے تمام شعبوں پر کامل دست گاہ رکھتے ہیں۔ مگر یہ بھی زمانہ کی نیرنگی ہے کہ وہ اس سے بھی زیادہ اہم مصروفیتوں میں مشغول ہیں۔ مجبوراً اس بے بال و پَر بے زور و زر نے اس کام کو شروع کر دیا۔ اس قادرِ مطلق پر توکل ہے۔ پھر اسکے نائبِ اکبر پر بھروسا ہے۔ وہ ہی قوت و طاقت عطا فرمائیں گے اور دستگیری فرما کر اِتمام کی توفیق دیں گے۔

سیر کی بنیادی کتابیں

سیر پر اگرچہ سینکڑوں تصنیفات موجود ہیں۔ مگر ان سب کا سلسلہ ان چاروں کتابوں پر منتہی ہوتا ہے، سیر ابن اسحٰق، سیر امام واقدی، طبقات ابن سعد، تاریخ طبری۔ ان کے علاوہ بقیہ جتنی کتابیں ہیں وہ تمام کی تمام انھیں کتابوں سے ماخوذ ہیں۔ البتہ بعض کتابوں میں کتب احادیث سے بھی مواد فراہم کیا گیا ہے۔ وہ مستثنیٰ ہیں یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے فنِ سیر کو غیر مستند و غیر معتبر ثابت کرنا چاہا ہے انھوں نے اپنی تنقید کی پوری قوت انھیں کتابوں پر صرف کر دی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم بھی ان چاروں کتابوں کے بارے میں علمائے جرح و تعدیل کی رائے نقل کر کے فیصلہ ناظرین پر چھوڑ دیں۔

محمد بن اسحٰق یہ تابعی ہیں۔ انھوں نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زیارت کی ہے۔ امام زہری کے تلمیذِ خاص ہیں۔ امام زہری تابعی اور جلیل القدر محدث، امام بخاری جیسے محدث کے مشائخ میں سے ہیں۔ ابن اسحٰق کی جلالتِ شان کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ امام زہری جیسے یگانۂ روزگار امام کے ایسے خاص تلمیذ ہیں کہ امام زہری کے دروازے پر دربان رہتا تھا۔ کوئی شخص بلا اجازت باریاب نہیں ہو سکتا تھا مگر ابن اسحٰق کو اجازت عام تھی جب چاہیں حاضر ہو جائیں۔

ان پر بعض محدثین نے بہت سخت جرحیں کی ہیں۔ یہاں تک کہ ہشام

بن عروہ پھر امام مالک پھر وہب پھر یحییٰ قطان نے کذّاب کہا۔

اخرجہ ابن عدی عن ابی بشر الدولابی ومحمد بن جعفر بن یزید عن ابی قلابۃ الرقاشی ثنی ابوداؤد وسلیمان بن داود قالا قال یحیی القطان ان محمدا بن اسحٰق کذاب قلت مایدریک قال قال وهب فقلت لوهب مایدریک؟ قال قال لی مالك بن انس فقلت لمالك وما یدریک قال قال هشام بن عروۃ قلت لهشام بن عروۃ وما یدریک قال حدث عن امرأتی فاطمۃ بنت المنذر وادخلت علیّ وهی بنت تسع وما راٰها رجل حتی لقیت اللّٰه۔

ابن عدی نے ابو بشر دولابی اور محمد بن جعفر بن یزید سے روایت کی وہ ابو قلابہ رقاشی سے روایت کرتے ہیں کہ مجھ سے ابوداؤد اور سلیمان بن داؤد نے بیان کیا کہ یحییٰ قطان نے کہا محمد بن اسحٰق کذّاب ہیں۔ میں نے پوچھا آپ نے کیسے جانا؟ انھوں نے بتایا کہ مجھے وہب نے اور ان کو امام مالک نے اور ان کو ہشام بن عروہ نے بتایا کہ وہ میری زوجہ فاطمہ بنت منذر سے روایت کرتے ہیں حالانکہ وہ نو سال کی عمر میں میرے یہاں آئی ہے اور زندگی بھر کسی غیر مرد نے اسے نہیں دیکھا۔

مگر عند التحقیق ابن اسحٰق کا ثقہ ہونا ہی ثابت ہے۔ سیر و مغازی کے علاوہ احکام میں بھی ان کی روایت لائق احتجاج ہے۔ ان پر جو جرحیں کی گئی ہیں ان کا ائمۂ حدیث نے جواب دیا ہے۔

ابھی جو جرح مذکور ہوئی۔ میزان میں اس کا جواب یہ دیا کہ اس جرح کا مدار یہی ہے نا، کہ فاطمہ بنت منذر کو کسی غیر مرد نے نہیں دیکھا۔ پھر ابن اسحٰق ان سے روایت کیسے کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ابن اسحٰق نے فاطمہ سے مسجد میں حدیث سنی ہو۔ یا بچپن میں سنی ہو۔ اس کا بھی احتمال ہے کہ فاطمہ نے پردہ کے پیچھے سے یہ حدیث ابن اسحٰق سے بیان کی ہو۔

امام ابن ہمام فتح القدیر میں فرماتے ہیں۔

توثیق ابن اسحٰق ھو الحق الابلج وما نقل عن کلام مالك فیه لا یثبت ولو صح لم یقبلہ اھل العلم کیف وقال شعبة فیہ ھو امیر المومنین فی الحدیث وروی عنہ مثل الثوری وابن ادریس وحماد بن زید وزید بن ربیع وابن عُلیّة وعبد الحارث وابن المبارك واحتملہ احمد وابن معین وعامة اھل الحدیث غفر اللہ تعالیٰ لھم وقد قال البخاری فی توثیقہ فی کتاب جزء القراءۃ خلف الامام لہ وذکرہ ابن حبان فی الثقات وان مالکاً رجع عن الکلام فی ابن اسحٰق واصطلح معہ وبعث الیہ ھدیہ۔

جزء القراءۃ خلف الامام

امام اسحٰق کا ثقہ ہونا ہی حق ظاہر ہے۔ امام مالک کا جو کلام انکے بارے میں منقول ہے وہ ثابت نہیں اور اگر وہ صحیح بھی ہو تو اسے اہل علم نے قبول نہیں کیا۔ کیسے قبول کریں حالانکہ شعبہ نے ان کی شان میں فرمایا ہے کہ وہ امیر المومنین فی الحدیث ہیں اور ان (ابن اسحٰق) سے ثوری اور ابن ادریس اور حماد بن زید اور زید بن ربیع اور ابن عُلیّہ اور عبد الحارث اور ابن مبارک جیسے (اکابر) نے روایت کیا ہے۔ امام احمد اور ابن معین نے ان سے روایت لی ہے اللہ تعالیٰ ان سب کی مغفرت فرمائے۔ اور امام بخاری نے اپنی کتاب جزء القراءۃ خلف الامام میں انکی توثیق کی اور ابن حبان نے انھیں ثقات میں ذکر کیا اور امام مالک نے ابن اسحٰق پر جو جرح کی تھی اس سے رجوع فرمایا اور ان سے صلح کر لی اور ان کے پاس ہدیہ بھیجا۔

ان پر جو جرحیں کی گئیں ہیں امام بخاری جزء القراءۃ میں اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

رأیت علی بن عبد اللہ یحتج بحدیث ابن اسحٰق۔ وقال علی عن ابن عیینة مارأیت احدا یتھم محمد بن اسحٰق

میں نے علی بن عبد اللہ کو ابن اسحٰق کی حدیث سے احتجاج کرتے دیکھا اور علی نے ابن عیینہ سے نقل کیا کہ میں نے کسی

کو نہیں جانا جس نے محمد ابن اسحٰق کو متہم
کیا ہو۔

ان اقوالِ ائمہ سے واضح طور پر ثابت ہو گیا کہ محمد بن اسحٰق ہر حیثیت سے ثقہ اور مستند ہیں۔ عام اہل حدیث نے ان سے روایت کی ہے۔ بلکہ حسب ارشاد شعبہ وہ حدیث میں امیر المومنین کے درجہ پر فائز ہیں۔ اور امام مالک نے جو ان پر جرح کی ہے۔ اسے اہل علم نے قبول نہیں کیا۔ بلکہ خود امام مالک نے اس سے رجوع کر لیا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ۔ بسا اوقات ائمہ حدیث کسی راوی پر جرح کرتے ہیں۔ مگر وہ جرح واقع کے مطابق نہیں ہوتی۔

امام ذہبی نے لکھا ہے کہ ابن اسحٰق، یہود و نصاریٰ سے روایت کرتے تھے۔ اور ان کو ثقہ جانتے تھے۔ ابن حبان نے اسی جرح کو ذرا واضح کر کے یوں بیان کیا ہے کہ محدثین کو ابن اسحٰق کی کتاب پر جو اعتراض تھا تو یہ تھا کہ انھوں نے خیبر کے واقعات ان یہودیوں سے نقل کئے ہیں جو مسلمان ہو گئے تھے۔ اور یہ واقعات ان لوگوں نے یہودیوں ہی سے سنے ہوں گے۔ اسلئے ان پر کامل اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جب کہ ابن حبان نے خود تصریح کر دی ہے کہ ابن اسحٰق نے خیبر کے واقعات یہودیوں سے نہیں لئے تھے بلکہ انھوں نے واقعات ان مسلمانوں سے لئے تھے جو پہلے کبھی یہودی تھے اور اسی بنا پر وہم کیا جا سکتا ہے کہ شاید ان لوگوں نے یہودیوں سے واقعات سنے ہوں لیکن جس طرح کسی کو یہ توہم ہوا اسی طرح ہم کو اس پر یقین ہے کہ ابن اسحٰق نے جو خیبر کے واقعات اپنی مغازی میں تحریر کئے ہیں۔ ان کے راوی یہود نہیں بلکہ مسلمان ہیں۔ کیونکہ ابن اسحٰق کی یہ روایتیں مرسل ہیں۔ اگر متصل ہوتیں تو راویوں سے خود معلوم ہو جاتا کہ یہ یہودی تھے کہ نصرانی یا مسلمان۔ اور یہ امر اپنی جگہ ثابت ہے کہ ثقہ اور مستند محدِّث جب کسی روایت کی سند حذف کرتا ہے تو اسی بنا پر حذف کرتا ہے کہ اسے راویوں کی تعدیل و توثیق پر پورا اعتماد ہے اور

یہی وجہ ہے کہ حدیث مرسل در بارۂ احکام بھی عند التحقیق حجت ہے۔ مقدمہ اشعۃ اللمعات میں ہے۔

ونزد ابوحنیفہ و مالک رحمۃ اللہ علیہما مقبول است مطلقا وایشان گویند کہ ارسال بجہت کمال وثوق واعتماد است زیراکہ کلام در ثقہ است واگر نزد وے صحیح نمی بود ارسال نمی نمود۔

امام ابوحنیفہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک مرسل مقبول ہے مطلقاً۔ اور یہ لوگ فرماتے ہیں کہ ارسال کمالِ وثوق اور اعتماد کی بناپر ہے اسلئے کہ کلام ثقہ کے ارسال میں ہے اگر اسکے نزدیک صحیح نہ ہوتی تو ارسال نہیں کرتا۔

خلاصۂ کلام یہ کہ ابن اسحٰق فن سیر کے نہایت ثقہ اور عادل امام ہیں۔ بلکہ عند التحقیق حدیث میں بھی مقبول و مستند ہیں۔ ان کی کتاب المغازی سیر میں متفقہ طور پر مستند اور لائقِ اعتبار کتاب ہے۔ ان کی وفات ۱۵۱ھ میں ہوئی۔

امام واقدی

ان کا نام محمد بن عمر الواقدی الاسلمی ہے۔ ان پر بعض علماء نے سخت سے سخت جرحیں کیں جیسا کہ میزان وتہذیب وغیرہ میں موجود ہے۔ اور آج کل تو تقریباً اس کو اجماعی مسئلہ بنانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ جوشِ تعصب میں لوگ یک طرفہ جرح نقل کرکے خوب خوب ان کا تمسخر اڑاتے ہیں لیکن ٹھنڈے دل سے تعصب نکال کر امام واقدی کے حالات جرح کے سلسلے میں لوگوں کے دعوی اور دلیل میں مطابقت اور استقصا کے ساتھ ان کے بارے میں جو کہا گیا ہے اس پر غور کرتے ہیں تو واقعہ اس کے بالکل برعکس نظر آتا ہے۔ اگر کچھ لوگ ان کو متروک، وضاع، کذاب کہہ رہے ہیں تو دوسرے ائمہ ان کو ثقہ عادل مستند بتا رہے ہیں یہاں تک کہ بعض ائمہ نے مخصوص طور پر اپنی کتابوں میں انکے ثقہ اور عادل ہونے کے عنوانات قائم کئے ہیں۔ ان کے متعلق تمام مختلف ہوافق اقوال نقل کرکے ایک ایک مخالف اقوال کا جواب دیا ہے۔ اور تمام موافق اقوال دلائل سے مؤید کرکے ان کا ثقہ ثبت عادل مستند ہونا ثابت کیا۔ امام

ابن ہمام صاحب فتح القدیر جن کی جلالت شان تبحر علمی تحقیق و تدقیق تمام دنیائے اسلام میں مُسَلّم ہے۔ فتح القدیر، فصلِ آسار میں فرماتے ہیں۔

قال فی الامام جمع شیخنا ابو الفتح الحافظ فی اول کتابہ المغازی والسیر من ضعّفہ ومن وثقہ ورجح توثیقہ وذکر الاجوبۃ عما قیل

امام واقدی کے بارے میں ہمارے شیخ ابو الفتح حافظ نے اپنی کتاب مغازی وسیر کے شروع میں مخالف و موافق تمام اقوال جمع کر کے ان کے ثقہ ہونے کو راجح ثابت فرمایا۔ اور ان پر جتنی جرحیں کی گئیں ہیں سب کا جواب دیا۔

علامہ بدر الدین محمود عینی "عمدۃ القاری" شرح بخاری میں فرماتے ہیں۔

وقال ایضاً الواقدی شدید الضعف اذا انفرد فکیف اذا خالف؟ قلت ذکر الحافظ المزنی ولم یتعرض الی شیٔ من ذالک ومن العجب ان الواقدی احد مشائخ الامام الشافعی ویحط علیہ ھذا الحط وھو ان کان ضعفہ بعضھم فقد وثقہ اُخرون فقال ابراھیم الحربی الواقدی امین الناس علی اھل الاسلام وعن مصعب بن زبیر ثقۃ مامون وکذا وثقہ ابو عبیدۃ واثنی علیہ ابن المبارک واُخرون۔

(ص ۲۵۹ جلد ۱۸)

یہ بھی کہا کہ واقدی جب منفرد ہوں تو بھی سخت ضعیف ہیں تو اگر مخالف ہوں تو کیا حال ہوگا یہ حافظ مزنی نے ذکر کیا۔ اور اس پر کچھ نہیں کہا تعجب یہ ہے کہ واقدی امام شافعی کے مشائخ میں سے ہیں اور یہ ان کو اتنا گرا رہے ہیں۔ امام واقدی کو اگرچہ بعض لوگوں نے ضعیف بتایا ہے مگر دوسرے لوگوں نے ان کو ثقہ کہا ہے ابراہیم حربی نے کہا۔ واقدی اہل اسلام کے امین ہیں مصعب بن زبیر سے مروی ہے کہ انہوں نے بھی واقدی کو ثقہ مامون کہا۔ یوں ہی ابو عبیدہ نے توثیق کی اور عبد اللہ بن مبارک اور دوسرے لوگوں نے ان کی تعریف کی۔

امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مشائخ میں سے ہونا ہی امام واقدی کی

جلالت شان کے لئے کافی تھا۔ اس سونے پر سہاگہ یہ کہ عبداللہ بن مبارک جو امام بخاری کے مشائخ میں سے ہیں اور ان کے ہم پلہ دوسرے اماموں نے ان کی تعریف کی ہے مصعب بن زبیر اور ابو عبیدہ جیسے مسلم الثبوت بزرگوں نے ان کو ثقہ مامون کہا ہے حتیٰ کہ ابراہیم حربی نے یہ شاندار خطاب دیا "امین الناس علی اہل الاسلام" کیا ان روشن تصریحات کے بعد بھی صاحب سیرۃ النبی وغیرہ کی یک طرفہ متعصبانہ جرح کی کوئی علمی حیثیت باقی رہ جاتی ہے؟ کہاں وہ شدومد کہ اگر واقدی سچا تو دنیا میں کوئی جھوٹا نہیں۔ اور کہاں ائمہ حدیث کی یہ زوردار توثیق و تعدیل۔ لوگ یہ سمجھے ہوئے تھے کہ اب علم دنیا سے اٹھ گیا اور اب تنقیدی جائزہ لینے والا کوئی موجود ہی نہیں جس پر ہم چھری چلا دینگے اسے دنیا مذبوح مان لے گی لیکن اب واقدی کے ساتھ بغض رکھنے والے سوچیں کہ دنیا ان ائمہ کے یہ ارشادات پڑھے گی تو انھیں کیا کہے گی؟

امام واقدی کے متعلق یہ بحث اور اختلاف اس صورت میں ہے کہ انکی مرویات دربارہ احکام مقبول ہیں کہ نہیں اور آپ نے دیکھا کہ راجح مختار یہی ہے کہ وہ باب احکام میں بھی ثقہ مامون مقبول مستند ہیں۔ رہ گیا سیر و مغازی، فضائل و معجزات کے ابواب۔ اس سلسلہ میں امام واقدی کا مقبول و مستند ہونا سب کے نزدیک مسلّم ہے۔ اس میں کسی ایک کا اختلاف نہیں جسکی دلیل تمام کتب سیر و مغازی میں ان کی مرویات کا اخذ و قبول ہے۔ اور اہل علم جانتے ہیں کہ تلقیِ امت کا کیا درجہ ہے۔ اسی لئے میزان میں فرمایا:

کان الی حفظہ المنتھی فی الاخبار والسیر والمغازی والحوادث وایام الناس وغیر ذالک	اخبار، سیر، مغازی، حوادث اور ایام وغیرہ میں امام واقدی ہی کے حفظ تک منتہی ہے۔

اسلئے سیر و مغازی کے سلسلہ میں ان کی مرویات کے مقبول و غیر مقبول ہونے کی بحث ایجاد بندہ سے زائد اور امت میں انتشار و افتراق کی

کوشش کے سوا اور کوئی علمی خدمت نہیں کی جا سکتی۔

امام واقدی کے وضّاع و کذّاب ہونے کے ثبوت میں آج سب سے بڑی دلیل جو پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہے

"اور حقیقت میں واقدی کی تصنیف خود اس بات کی شہادت ہے۔ ایک ایک جزئی واقعہ کے متعلق جس قسم کی گوناگوں اور دلچسپ تفصیلیں وہ بیان کرتا ہے آج کوئی بڑا سے بڑا واقعہ نگار چشم دید واقعات قلم بند نہیں کر سکتا" (سیرت صفحہ ۴۴)

اس مبارک متن کی شرح یہ ہے کہ مثلاً حضرت خالد بن ولید سیف اللہ رضی اللہ عنہ نے فلاں جنگ میں فلاں پہلوان سے مقابلہ کیا۔ جو اتنا موٹا تگڑا تھا۔ اس کے پاس فلاں فلاں اسلحہ تھے، فلاں فلاں لباس پہنے ہوئے تھا۔ اس نے آکر پہلے یہ کہا۔ حضرت خالد نے اس کا یہ جواب دیا پھر اس نے نیزہ کا وار کیا۔ حضرت خالد نے رد کر دیا یا پینترا بدل کر وار خالی دیا اور آگے بڑھ کر اس کا نیزہ چھین لیا۔ اب اس پہلوان نے تلوار چلائی۔ حضرت خالد نے اسے سپر پر لیا۔ پھر سیف اللہ نے تلوار کا ایسا وار کیا کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ یا وہ تلوار اس کے سر پر پڑی۔ خود کٹا، سیر دو ٹکڑے ہو گیا۔ تلوار سر سے گزر کر کمر تک چیرتی ہوئی نکل گئی۔ (یہ صرف تمثیلاً ہے کوئی واقعہ نہیں)

علامہ کا فرمانا ہے کہ یہ تمام تفصیلات یاد کر لینا آج کے اہل حفظ وضبط کی قوت سے باہر ہے۔ لہذا یہ جھوٹ اور من گھڑت ہے لیکن قبلہ اس زمانہ کے اہل حفظ وضبط پر اس زمان برکت نشان کے حُفّاظ کو قیاس کرنا ہی وہ غلطی ہے جس کے بعد کتب حدیث کا پورا ذخیرہ فرضی داستان کی صف میں آجاتا ہے۔ اس بنیادی غلطی کو دور کرنے کے لئے ہم ناظرین کو ذرا تفصیلی مطالعہ کی تکلیف دے رہے ہیں۔

امام واقدی اگر کسی جزئی واقعہ کی جملہ تفصیل بیان کریں تو وہ ان کے کذاب ووضاع ہونے کی شہادت ہے۔ لیکن بخاری اور مسلم میں بھی اس قسم کی تفصیلات موجود ہیں تو پھر آپ کیا فتویٰ صادر فرمائیں گے۔ اٹھائیے صحیحین اور ملاحظہ کیجئے۔ سید الشہدا۔ سیدنا حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کا واقعہ جس تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔ کیا وہ واقدی کی بیان کردہ تفصیلات سے کسی طرح کم ہے؟۔۔۔۔ اسی طرح خود آپ کی اصح کتب بعد کتاب اللہ میں ایک دو نہیں دسیوں جزئیات کی وہ حیرت انگیز تفصیلیں مذکور ہیں جو واقدی نے بھی نہیں بیان کیں۔ مثلاً غزوۂ بدر میں حضرت زبیر بن عوام اور ابوذات کرش کا مقابلہ اور اس کی پوری تفصیل کیا۔ امام واقدی کی بیان کردہ تفصیلات سے کم ہیں۔ ابوذات کرش کس طرح لوہے میں غرق آیا۔ حضرت زبیر نے کیسے اس کی آنکھ میں برچھی ماری اور یہ برچھی پھر کیسے نکلی اور اس کی نوک ٹیڑھی ہوئی۔ پھر کس کے پاس رہی۔ پھر کس نے کس قیمت پر خریدی کیا واقدی کے یہاں کسی مجاہد کی تلوار یا برچھی کے بارے میں اتنی لمبی معلومات ہیں۔ پھر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اگر امام بخاری جزئی جزئی باتوں کی تفصیلات بیان کریں تو وہ حفظ وضبط کے جبلِ شامخ ہوں اور اسی کو آپ بیان کریں تو آپ کی کتاب اصح کتب ہو اور امام واقدی بیان کریں تو جھوٹے کذاب وضاع ہوں ان کی کتاب میں ہو تو وہ اکذبِ کتب ہو۔ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ۔

بات دراصل یہ ہے کہ اس زمانہ میں جنگ کا شجاعانہ طریقہ یہ تھا کہ فوج سے ایک ایک آدمی نکل کر مقابلہ کرتے۔ اور ابتداءً فوج کے منتخب تجربہ کار افراد باہر نکلا کرتے۔ ایسی صورت میں پوری فوج کو لڑنے والوں کی جملہ حرکات وسکنات بغور دیکھنے کا بہت اچھا موقع ملتا تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ فوج کو وہ ساری تفصیل معلوم ہو جاتی جو ان دونوں نبردآزما

کو پیش آتی۔ اور اگر عام دھاوا ہو جاتا جسے اس وقت جنگ مغلوبہ کہا جاتا تھا تو بھی جو لوگ جنگ کے طریقہ کار سے واقف ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ مقابلہ ہمیشہ ماہر بہادر کیا کرتے تھے۔ ان کے آس پاس کچھ لوگ ان کی امداد اور حفاظت کے لئے موجود رہتے، یہ لوگ اپنے اپنے نبرد آزما کی ہر حرکت و نقل پر پورے تیقظ کے ساتھ نگاہ رکھتے تھے۔ اس بنا پر جنگ مغلوبہ کی صورت میں بھی کچھ لوگوں کا ہر قسم کی تفصیلی معلومات محفوظ کر لینا بعید از قیاس نہیں۔ عام طور پر اس قسم کی تفصیلات باعثِ دلچسپی ہوتی ہیں۔ لوگ سننے سنانے کے شائق ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ سینہ بہ سینہ منتقل ہو کر سفینہ میں محفوظ ہو جاتی ہیں۔

یہی چیز امام واقدی کے یہاں موجود ہے۔ پھر اس پر طعن کرنا انصاف و دیانت کا خون کرنا ہی نہیں بلکہ جمیع کتبِ احادیث کے دفتر کو برباد کرنے کا دروازہ کھولنا ہے۔ بنیادی غلطی یہ ہے کہ اُس زمانے کے حُفّاظ کو آج کے مشاہدین و مورخین پر قیاس کیا گیا۔ آپ ذرا سوچئے حضرت امام بخاری کے متعلق محدثین نے تصریح کی ہے کہ ان کو چھ لاکھ حدیثیں یاد تھیں۔ انھوں نے خود فرمایا ہے۔ میں نے اپنی جامع صحیح کو تین لاکھ صحیح احادیث سے منتخب کیا ہے۔ یہ تین لاکھ احادیث تو بہت ہیں صرف صحیح بخاری میں جتنی احادیث ہیں ان کو مع سند آج کا کوئی متحفظ یاد کر سکتا ہے؟ نہیں ہرگز ہرگز نہیں مگر امام بخاری کے حفظ و ضبط کو سنئے۔ انہوں نے چھ لاکھ احادیث کو بھی یاد کیا اور ان کے متعلق اس قسم کی گوناگوں تفصیلیں بھی یاد رکھیں۔ فلاں متن کی فلاں سند ہے۔ اس کے رُواۃ میں تلمیذ و شیخ کی یہ ترتیب ہے۔ شیخ کی وفات فلاں وقت ہوئی۔ تلمیذ فلاں وقت سماع و تحمل کے لائق ہوا۔ تلمیذ و شیخ میں ملاقات ہوئی۔ فلاں سند میں فلاں راوی ثقہ ہے۔ فلاں مطعون ہے۔ اس پر طعن یہ ہے۔ مثلاً وہ متروک ہے منکر ہے فلاں

مختلط ہے، فلاں مجہول ہے۔ فلاں مدلس ہے۔ فلاں فاسق ہے۔ فلاں مبتدع ہے، فلاں کذاب ہے۔ فلاں وضاع ہے۔ اس راوی پر فلاں محدث نے یہ طعن کیا۔ فلاں نے یہ جواب دیا۔ فلاں نے اس کے بارے میں مجھ سے یہ کہا۔ مگر صحیح یہ ہے کہ وہ ویسا نہیں۔ یہ حدیث اس سند سے صحیح ہے اس سند سے حسن ہے۔ اس سند سے ضعیف ہے۔ صحیح کے درجے سے تنزل کی وجہ یہ ہے، ضعیف اس وجہ سے۔ یہ حدیث میں نے شیخ کے سامنے پڑھی، وہ حدیث شیخ نے پڑھ کر مجھے سنائی تھی۔ یہ مجمع میں سنی یا سنائی وغیرہ وغیرہ۔

احادیث کے متعلق یہ ساری تفصیلات اتنی ضروری اور اہم ہیں کہ اگر یہ تفصیلیں نہ یاد کی جائیں تو پھر حدیث صحیح و حسن و ضعیف میں بلکہ حدیث و غیر حدیث میں امتیاز مشکل ہو جائے اسی وجہ سے اس عہد کے تمام محدثین اور فقہا احادیث کے متن کے ساتھ ساتھ اس قسم کی جملہ تفصیلات کامل طور سے محفوظ رکھتے تھے۔ اور آج اس دور ترقی میں بڑا سے بڑا مدعی متحفظ واقعات کے بارے میں اس قسم کی آدھی تفصیل بھی یاد نہیں رکھ سکتا ایسی صورت میں اپنی قوت یادداشت پر قیاس کر کے محدثین و فقہا پر طعن کرنے والے کو آپ بھی یہی جواب دیں گے۔

ع کارِ پاکاں را قیاس از خود مگیر

اسلئے امام واقدی پر آپ کے طعن کے جواب میں ہم بھی یہی عرض کر کے رخصت ہوتے ہیں کہ اگر واقدی پر آپ کی جرح صحیح مان لی جائے تو اگر آپ ہی سے سیکھ کر کوئی یہ کہے۔

حقیقت یہ ہے کہ محدثین اور فقہا کی تصانیف خود اس بات کی شہادت ہیں ایک ایک جزئی روایت کے متعلق اس قسم کی گوناگوں اور دلچسپ تفصیلیں وہ یاد رکھتے ہیں کہ آج بڑے

سے بڑا مدمغ متحفظ بھی نہیں یاد رکھ سکتا۔

تو بولئے دین و مذہب کا کوئی ٹھکانا رہا؟ بخاری و مسلم کو جانے دیجئے جناب کی اصح کتب کا کیا حال ہوگا۔ یہی مجھے رونا ہے کہ آپ نے نشۂ تحقیق و تصحیح میں وہ وہ لکھ مارا ہے۔ جس کی رُو میں تمام دینیات بہ سکتے ہیں۔

ہم اس بحث کو اس تصفیہ پر ختم کرتے ہیں۔ امام واقدی کا ثقہ عادل مستند ہونا ہی صحیح و مرجح ہے۔ ان کی مرویات در بارہ احکام بھی مقبول ہیں اور سیر و مغازی کے وہ بالاتفاق امام مستند ہیں۔ یہی میزان میں فرمایا۔

وکان الی حفظ المنتھی فی الاخبار و السیر والمغازی والحوادث وایام الناس وغیر ذالك	امام واقدی کے ہی حفظ تک اخبار، سیر، مغازی، حوادث، واقعات وغیرہ میں منتہیٰ ہے۔

ان کی وفات ۲۰۷ھ میں ہوئی۔

ابن سعد

ان کا نام بھی محمد ہے۔ کاتبِ واقدی سے مشہور ہیں امام واقدی کے تلمیذ خاص ہیں۔ نہایت ثقہ مستند، مقبول الحدیث، صاحبِ سیرۃ امام ہیں اس کے باوجود کہ لوگوں نے انکے استاذ پر سخت سے سخت جرحیں کیں ہیں۔ مگر ان کو سب نے متفقہ طور پر ثقہ اور عادل کہا ہے۔ ان کی کتاب کا نام "طبقات ابن سعد" ہے۔ یہ بارہ جلدوں کی مبسوط کتاب ہے۔ ان میں دو جلدیں کتب سیر نبوی ہیں۔ بقیہ دس جلدیں صحابہ و تابعین کے حالات میں ہیں۔ یہ کتاب نایاب ہو چکی تھی۔ جرمن نے بڑے اہتمام سے چھاپ کر شائع کیا ہے۔

جدید مہربانوں کو جب کوئی گنجائش نہ ملی تو لامحالہ انھیں ثقہ کہنا پڑا لیکن اس طرح سیرت کا بہت بڑا ذخیرہ مستند ہو جاتا تھا۔ اس لئے ان پر بے تکی جرح کر دی۔

ابن سعد کی نصف سے زیادہ روایتیں واقدی کے ذریعہ سے ہیں۔ اس لئے ان روایتوں کا وہی رتبہ ہے جو خود واقدی کی روایتوں کا ہے۔ باقی رُواۃ میں سے بعض ثقہ ہیں اور بعض غیر ثقہ۔ یعنی حسب تحقیق آنجناب واقدی جھوٹے کذاب وضّاع اور ان کی مرویات کذب وجعل۔ اور حدیث میں فرمایا۔

من حدث عنی بحدیث یری انہ کذب فھواحد الکاذبین	جو ایسی حدیث بیان کرے جسے جانتا ہو کہ جھوٹی ہے۔ تو وہ خود بھی جھوٹا ہے

لہذا ابن سعد خود بھی جھوٹے کذاب ہوئے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ انہیں اپنے استاذ واقدی کا جھوٹا کذاب ہونا معلوم نہ تھا۔ انھوں نے لاعلمی میں روایت کر دیا تو دوسری حدیث سنئے۔ فرماتے ہیں۔

کفیٰ بالمرء کذبا ان یحدّث بکل ماسمع۔	کسی کے جھوٹے ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ ہر سنی ہوئی بات بیان کر دے۔

اس طرح بھی ابن سعد کا دامن جھوٹ کے داغ سے بری نہیں ہو سکتا۔ پھر مجھے تو حیرت ہے ہی ہر ناظر کو حیرت ہوگی کہ ابن سعد کے بارے میں خطیب بغدادی کا یہ قول کس منہ سے نقل کیا گیا۔

کان من اھل العلم والفضل والفھم والعدالۃ صنف کتابا کبیرا فی طبقات الصّحابۃ والتابعین الی وقتہ فاجاد فیہ واحسن۔	ابن سعد اہل علم وفضل وفہم صاحب عدالت ہیں صحابہ اور اپنے وقت تک کے تابعین کے طبقات میں ایک بہت بڑی کتاب تصنیف کی جو بہت عمدہ اور اچھی کتاب ہے۔

اپنی کتاب میں وہ بھی نصف سے زائد وضاع کذاب کی روایت داخل کرنا اس پر بغیر نقد وجرح کئے بیان کرنا۔ صاحب علم وفضل، فہم وعدالت کا کام نہیں لیکن جیسا کہ میں پہلے ثابت کر آیا ہوں۔ امام واقدی ثقہ عادل مامون مقبول ہیں اس لئے ان کی وجہ سے ان کے تلمیذ جلیل پر بھی حرف نہیں آسکتا

اور نہ ان کی تصنیف پر۔ ان کی وفات ۲۳۰ھ میں ہوئی ہے۔

امام واقدی اور ان کے تلیذ ابن سعد پر اتنی زوردار جرح صرف اس وجہ سے ہے کہ علامہ کی دانست میں یورپ کے مستشرقین کو اعتراض کرنے کے مواد انھیں کی کتابوں سے ملے ہیں۔ چنانچہ تحریر فرماتے ہیں۔

سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کا تمام تر سرمایۂ استناد صرف سیرت و تاریخ کی کتابیں ہیں مثلاً مغازیِ واقدی، سیرتِ ابن ہشام، سیرِ محمد بن اسحٰق، تاریخِ طبری وغیرہ۔ ص۹۷

دوسری جگہ ہے۔

مثلاً اہلِ یورپ واقدی کے بیان پر سب سے زیادہ اعتماد کرتے ہیں ص۹۹

یورپین متعصبین کے اعتراض کے جوابات یہ نہیں تھے کہ یہ ائمہ جھوٹے کذاب و وضاع، ناقابلِ استناد ہیں۔ بلکہ ان کے تعصب، خیانت کی پردہ دری ہے لیکن کیا جائے شمس العلما ہونا اور بات ہے اور دین میں تفقہ و تیقظ اور چیز ہے۔

محب الدین بن جریر طبری

یہ بھی مسلم الثبوت، عادل، ثقہ، مستند محدث اور مفسر ہیں۔ انکی تفسیر احسن التفاسیر سمجھی جاتی ہے۔ ان کی کتاب تاریخ کبیر نہایت مفصل اور جامع مستند کتاب ہے۔ ان کی یہ کتاب بھی نایاب تھی یورپ نے چھاپ کر شائع کیا۔ ان پر سلیمانی نے یہ طعن کیا کہ یہ روافض کے لئے حدیثیں وضع کیا کرتے تھے۔ اس کا جواب علامہ ذہبی نے ان زوردار الفاظ میں دیا۔

هذا رجم بالظن الكاذب بل ابن جرير من كبائر ائمة الاسلام والمعتمدين۔	یہ جھوٹی بدگمانی ہے۔ حقیقت میں ابن جریر اسلام کے ایک بڑے امام اور معتمد ہیں۔

ان پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ ان کے بعض شیوخ مثلاً سلمہ ابرش ضعیف

ہیں لیکن سلمہ ابرش کو ابن معین جیسے ماہر نقاد نے ثقہ کہا ہے۔ خصوصاً سیر و مغازی میں سلمہ کی سیر کو احسن السیر کہا ہے۔ اور تقریباً یہی حال امام طبری کے دوسرے مشائخ کا ہے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ طبری امام معتمد ثقہ ہیں۔ ان کی کتاب تاریخ کبیر بہت مقبول و مستند کتاب ہے۔ بعد کے تمام مورخین کا یہی ماخذ ہے ان کی وفات ۳۱۰ھ میں ہوئی ہے۔

یہ چاروں کتابیں سیر و مغازی کی بنیاد ہیں۔ اس لئے فن سیرت کو بے اعتبار کرنے کے لئے ان پر سخت سے سخت طعن کئے گئے ہیں لیکن سطور بالا پڑھنے والوں پر یہ بات اچھی طرح روشن ہوگئی کہ محض طعن و جرح سے یہ فن مجروح نہیں ہوسکتا اور نہ یک طرفہ جرح سے کسی امام کو ناقابل استناد کہا جا سکتا ہے۔ ان ائمہ پر اگر کچھ ناقدین نے طعن کئے تو دوسرے اکابر نے اس کا جواب دیا۔ ان کو ثقہ معتمد کہا۔ اور جب مصنفین مستند ہیں تو ان کی تصنیفات کا مستند ہونا بدیہی امر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام دنیائے اسلام نے ان ائمہ کی کتابوں کو قبول کیا۔ انھیں کتابوں سے روایتیں اخذ کرکے دوسری کثیر تصانیف تیار کیں۔ ماہر دینیات جانتا ہے کہ تلقی امت خود کسی تصنیف کے معتمد و مستند ہونے کے لئے کافی ہے۔ لیکن ماتم کی بات یہ ہے کہ اب یہ شگوفہ کھلایا جا رہا ہے۔

> "لیکن افسوس ہے کہ ان لوگوں کا مستند ہونا ان کی تصنیفات کے مستند ہونے پر چنداں اثر نہیں ڈالتا۔ یہ لوگ شریکِ واقعہ نہیں۔ اس لئے جو کچھ بیان کرتے ہیں۔ اور راویوں کے ذریعہ بیان کرتے ہیں لیکن۔ ان کے بہت سے رُواۃ ضعیف الروایہ اور غیر مستند ہیں۔ اس کے علاوہ ابن اسحٰق کی اصل کتاب ہندوستان میں موجود نہیں۔ ابن ہشام نے ابن اسحٰق کی کتاب کو ترتیب اور تہذیب کے بعد جس صورت میں بدل دیا وہی آج موجود ہے لیکن ابن ہشام نے

ابن اسحٰق کی کتاب کو زیاد بکائی کے واسطہ سے روایت کیا ہے
بکائی اگرچہ رتبہ کے شخص ہیں تاہم محدثین کے اعلیٰ معیار سے فروتر
ہیں۔

ابن مدینی (امام بخاری کے استاد) کہتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے
میں نے اس کو ترک کر دیا۔

ابو حاتم کہتے ہیں وہ استناد کے قابل نہیں۔ نسائی کہتے ہیں
وہ ضعیف ہیں۔ ابن سعد کی نصف سے زیادہ روایتیں واقدی
کے ذریعہ سے ہیں۔ اسی لئے ان روایتوں کا وہی رتبہ ہے جو خود
واقدی کی روایتوں کا ہے۔ باقی رواۃ میں بعض ثقہ ہیں اور بعض غیر
ثقہ۔ طبری کے بڑے بڑے شیوخ روایت مثلاً سلمہ ابرش، ابن سلمہ
ضعیف الروایہ ہیں۔ (سیرۃ النبی ص۴۵)

کتب سیر کے متعلق وہ بھی بنیادی کتابوں کے بارے میں اس تبصرے
سے ہر شخص یہی سمجھے گا کہ جب ائمہ فن اور ان کی تصنیفات کی یہ ناگفتہ بہ حالت
ہے کہ جھوٹ، کذب، متروک غیر مستند مرویات سے بھری ہوئی ہیں تو پھر اس
مبارک فن کی وقعت شاہنامہ فردوسی سے زائد اور کیا ہوگی۔ لیکن پھر حیرت اور
سخت حیرت ہے کہ جس شخص کی یہ تحقیق ہو وہی اس عظیم فن پر تمام دنیا سے
ان الفاظ میں کس طرح مباہات کرتا ہے۔

مسلمانوں کے اس فخر کا قیامت تک کوئی حریف نہیں ہو سکتا
کہ انھوں نے اپنے پیغمبر کے حالات اور واقعات کا ایک ایک حرف
اس استقصا کے ساتھ محفوظ رکھا ہے کہ کسی شخص کے حالات
آج تک اس جامعیت اور احتیاط کے ساتھ قلم بند نہیں ہو سکے۔
اور نہ آئندہ توقع کی جاتی ہے۔ (ص۸)

علامہ تو موجود نہیں کہ ان سے کچھ گزارش کریں۔ لیکن ہر ذی انصاف

سے اتنی بات کہنی ہے کہ زیاد بکائی کے واسطہ سے جو ضعف بقول آپ کے پیدا ہوگیا وہ سیرت ابن ہشام میں پیدا ہوگا۔ رہ گئی ابن اسحٰق کی کتاب تو وہ زیاد بکائی کے واسطہ سے پاک ہے۔ پھر خواہ مخواہ کھینچ تان کر اسے ضعیف بتانا دیانت کا خون کرنا ہے۔ رہ گئی سیرابن ہشام تو اولاً ابن اسحٰق کی اصل کتاب ہندوستان میں بھی موجود ہے اور ہندوستان سے باہر بھی موجود ہے۔ اگرچہ بہت کم۔۔۔۔۔اس سے مقابلہ کرکے ابن ہشام کی کتاب میں زیاد بکائی کے واسطہ سے جو ضعف بقول آپ کے پیدا ہوگیا ہے دور کیا جاسکتا ہے۔

ثانیاً۔ زیاد بکائی کا رتبہ آپ کو بھی تسلیم ہے۔ ان کا یہ مسلمہ رتبہ کس سلسلہ میں ہے۔ ان کا یہی رتبہ آپ ظاہر کر دیتے تو آپ کی حق پرستی پر کسی کو کوئی شبہہ نہیں ہوتا۔ زیاد بکائی سیر و مغازی میں بالاتفاق ثقہ و مستند ہیں۔ ابن مدینی، ابو حاتم نسائی کا ان پر طعن وہی درجہ رکھتا ہے جو ابن اسحٰق وغیرہ پر طعن کا ہے۔

ثالثاً۔ اس طعن کا حاصل صرف یہ کہ وہ ضعیف الروایۃ ہیں۔ اور فضائل و سیر میں روایات ضعاف بالاجماع مقبول ہیں جس کی مفصل بحث ابھی آتی ہے رہ گئی طبقاتِ ابن سعد، جب کہ امام واقدی کا ثقہ و مستند ہونا ثابت ہو چکا تو اس کتاب کے نصف سے زائد حصہ کا مستند و مقبول ہونا ثابت ہوگیا رہ گئیں نصف سے کم روایتیں ان میں بعض کا ثقہ ہونا آپ کو بھی مسلّم۔ اس بعض سے آپ کی مراد کیا ہے۔ اکثر یا اقل۔ اگر اکثر مراد ہیں تو آپ ہی کی تحقیق کے مطابق طبقات کا ربع سے بھی کم غیر مامون رہا۔ اور آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ کسی کتاب میں کچھ حصہ اگر رطب و یابس ہے تو وہ کتاب غیر معتمد نہیں کہی جاتی ورنہ امان اٹھ جائے۔ کوئی کتاب سوائے قرآن مجید کے مستند نہ رہے گی۔

طبری کی تاریخ کبیر کے بعض رُواۃ مثلاً سلمہ ابرش و ابن سلمہ وغیرہ پر جو

طعن ہیں وہ اولاً مرجوح ہیں۔

ثانیاً :۔ ان کا مفاد یہی ہے کہ وہ ضعیف ہیں اور سیر و مغازی میں ضعاف بالاتفاق مقبول ہیں جیسا کہ آپنے خود ابن معین کا قول نقل کیا ہے کہ وہ سیر و مغازی ہیں ان کی توثیق کرتے تھے۔ اوران کی سیرت کو بہترین سیرت کہتے ہیں۔

حیرت بالائے حیرت یہ ہے کہ اس زور و شور کی تنقید کے بعد جو نتیجہ نکلا وہ صرف اتنا۔

اس بنا پر مجموعی حیثیت سے سیرۃ کا ذخیرہ کتب حدیث کے ہم پلہ نہیں البتہ ان میں تحقیق و تنقید کے معیار پر جو اتر جائے وہ حجت اور استناد کے قابل ہے۔ ص ۴۵

اس نتیجہ کو دیکھ کر ہمیں شبہہ ہوتا ہے کہ یہ نتیجہ انھیں مقدمات کا ہے جو ابھی مذکور ہوئے یا کسی اور کا۔ پھر یہ کہ اولاً کس نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ کتب سیر، کتب حدیث کے ہم پلہ ہیں۔ پھر اس کی تغلیط کے لئے آپ نے اتنی زحمت کیوں اٹھائی ؟

ثانیاً :۔ آپ کا دعویٰ یہ تھا۔ یہ کتابیں مستند نہیں۔ اور ثابت یہ ہوا کہ کتب حدیث کے ہم پلہ نہیں۔ کسی فن کی کتابیں اگر کتب حدیث کے ہم پلہ نہ ہوں تو ان کا غیر مستند ہونا کیسے لازم ؟ سیر کا درجہ استناد مخصوص ہے۔ اور احادیث کا مخصوص۔ اگر ایک فن اپنے اعلیٰ فن سے فروتر ہو تو اس کو بے اعتبار کہنا کیسے صحیح ہے۔ اس طرح تو ایک بیباک یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ کتب احادیث غیر مستند ہیں۔ دلیل یہ دے کہ یہ قرآن کے ہم پلہ نہیں اور جب علم حدیث کا یہ حال ہے تو علم فقہ و تفسیر سب صاف یہ تحقیق ہے یا علوم دینیہ کے تباہ و برباد کرنے کی یورپین مشین ؟

ثالثاً :۔ یہ بات تو حق ہے کہ فن سیر، فن حدیث کے بلند درجہ

کے مساوی نہیں۔ مگر آپ یہ بھی نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے کہ آپ کی تنقید کی زُد جتنی تیز کتب سیر کی طرف ہے اتنی ہی کتبِ حدیث کی طرف بھی ہے۔ آپ نے ہی احادیث کی مسلم الثبوت کثیر کتابوں کے بارے میں لکھا۔!

"ان کتابوں کی قسم میں کثرت سے جھوٹی حدثیں موجود ہیں جن پر اعتماد کرنا جائز نہیں"۔

مستدرک کے بارے میں تحریر فرمایا۔

"اس میں بہت سی جھوٹی اور موضوع حدثیں موجود ہیں"۔

آپ ہی نے اصفہانی، حیثم بن سلیمان، ابو نعیم، ابو بکر خطیب، ابو الفضل، ابو موسیٰ مدینی، ابن عساکر، عبد الغنی وغیرہ کی کتابوں کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی۔

"ان میں بہت سی ضعیف اور موضوع اور مہمل حدثیں ہیں"۔

آپ نے ہی وہ حدیث جس میں وقتِ ولادت ایوانِ کسریٰ کے کنگرے گرنے کا ذکر ہے بیہقی، ابو نعیم، خرائطی، ابنِ عساکر اور ابن جریر کی روایت کے باوجود یہ کہہ کے رد کر دیا کہ وہ بخاری اور مسلم صحاح ستہ میں نہیں۔

آپ ہی نے صحاح ستہ کی کثیر احادیث کو صرف اس بنا پر ناقابل قبول بتایا کہ وہ آپ کے خیال میں دلائل عقلیہ و قرآن کے مطابق نہ تھیں۔ جب آپ کی تحقیق کے بموجب تمام کتب حدیث کتب سیر کی طرح احادیث موضوعہ مکذوبہ و مہملہ مردودہ پر مشتمل ہیں تو آپ کس منطق سے کتب احادیث کے کتب سیر پر تفوق کی جانب ان الفاظ میں اشارہ کر رہے ہیں۔

"اس بنا پر سیرت کا ذخیرہ کتب حدیث کے ہم پلہ نہیں"۔

اب تو آپ کوا ور آپ نہیں رہے تو آپ کے مقلدین کو نہایت اطمینان کے ساتھ اعلان کر دینا چاہیئے کہ

احادیث کا ذخیرہ ہماری تحقیق کے ہم پلہ نہیں، البتہ جو تحقیق وتنقید کے معیار پر اتر جائے وہ حجت اور استناد کے قابل ہے اور اگر کوئی محدثین کے ثقہ اور عادل ضابط محتاط ہونے کو پیش کرے تو صاف صاف اپنی یہ تحقیق پیش کر دیں۔

لیکن افسوس ہے کہ ان لوگوں کا مستند ہونا ان کی تصانیف کے مستند ہونے پر چنداں اثر نہیں ڈالتا۔ ان لوگوں نے خود حضور سے نہیں سنا ہے۔ جو کچھ بیان کرتے ہیں اور اور راویوں کے ذریعہ بیان کرتے ہیں۔ لیکن ان کے بہت سے رُواۃ ضعیف الروایۃ اور غیر مستند ہیں۔

فن سیرت کی گردن پر یہ چھری صرف اس بنا پر چلائی گئی ہے کہ علامہ کا گمان یہ تھا۔

"مسلمانوں نے اس فن سیر کا جو معیار قائم کیا وہ اس سے بہت زیادہ بلند تھا اس کا پہلا اصول یہ تھا کہ جو واقعہ بیان کیا جائے اس شخص کی زبان سے بیان کیا جائے۔

جو خود شریک واقعہ تھا اور اگر خود نہ تھا تو شریک واقعہ تک تمام راویوں کا نام بہ ترتیب بتایا جائے۔ اس کے ساتھ یہ بھی تحقیق کی جائے جو اشخاص سلسلۂ روایت میں آئے کون لوگ تھے، کیسے تھے، کیا مشاغل تھے۔ چال چلن کیسا تھا، حافظہ کیسا تھا، سمجھ کیسی تھی، ثقہ تھے کہ غیر ثقہ، سطحی الذہن تھے یا دقیقہ بیں، عالم تھے یا جاہل"۔ (ص ۳۵)

فن سیر کا اتنا بڑا معیار سمجھنا ہی بنیادی غلطی ہے، یہ عقائد واحکام کے لئے معیار ہے، مگر سیر و مغازی فضائل و مناقب کے لئے ہرگز نہیں۔ ائمۂ سیر اور محدثین سب اس پر متفق ہیں کہ سیر و مغازی میں

موضوع کے علاوہ ہر قسم کی روایتیں مقبول ہوں گی۔ ظاہر ہے بانیانِ فن کے قائم کردہ معیار کے علاوہ جدید معیار قائم کر کے فن سیرت کو پرکھا جائے گا تو سوائے بھٹکنے اور ٹھوکریں کھانے کے اور کیا حاصل ہوگا۔ جس طرح آیات قرآنیہ کے معیار پر احادیث کو پرکھنے سے احادیث غیر مستند نظر آئیں گی اسی طرح احادیث کے بلند معیار پر سیر و مغازی پرکھنے سے یہ کھوٹی دکھائی دیں گی۔ مگر یہ حقیقت میں فن سیر کا کھوٹ نہیں بلکہ نقاد کی ذہنیت کا۔ اب آئیے علمائے سیر و ائمہ محدثین کے ارشادات سنئے۔

(۱) امام زین الدین عراقی سیرت منظوم میں فرماتے ہیں۔

ولیعلم الطالب ان السیر	طالب کو معلوم ہو کہ فن سیرت صحیح
یجمع ما صح و ما قد انکرا	اور منکر سب کو جمع کرتا ہے۔

(۲) امام احمد بن حنبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔

ابن اسحٰق رجل تکتب عنه هذه الاحادیث یعنی المغازی ونحوها واذا جاء الحلال والحرام اردنا قوما هکذا وقبض الاصابع الاربع۔ (فتح المغیث)	ابن اسحٰق اس درجہ کے آدمی ہیں کہ ان سے مغازی وغیرہ کی حدیثیں مقبول ہیں اور جب حلال و حرام کی باری آتی ہے تو ہم ایسے لوگوں کو چاہتے ہیں اور اپنی انگلیاں دبا کر بند کرلیں۔

(۳) امام بیہقی نے کتاب المدخل میں ابن مہدی کا یہ قول نقل کر کے ثابت رکھا۔

اذا روینا فی الحلال والحرام و الاحکام شددنا فی الاسانید وانتقدنا فی الرجال واذا روینا فی الفضائل والثواب والعقاب سهلنا فی	جب ہم حلال و حرام میں روایت کرتے ہیں تو سند میں شدت کرتے ہیں راویوں کو پرکھ لیتے ہیں۔ اور جب فضائل ثواب و عقاب میں روایت

الاسانید وتسامحنا فی الرجال (فتح المغیث)

کرتے ہیں تو سند میں نرمی کرتے ہیں اور راویوں کے متعلق چشم پوشی کرتے ہیں۔

یہ تینوں عبارتیں سیرت النبی میں بھی ہیں۔

(۴) علامہ حلبی سیرۃ انسان العیون میں فرماتے ہیں۔

لایخفی ان السیر یجمع الصحیح و السقیم والضعیف والبلاغ والمرسل والمنقطع والمعضل دون الموضوع و قد قال الامام احمد وغیرہ من الائمۃ اذا روینا فی الحلال والحرام شددنا واذا روینا فی الفضائل ونحوھا تسامحنا۔

پوشیدہ نہ رہے کہ فن سیرت موضوع کے علاوہ صحیح، سقیم، ضعیف، بلاغ، مرسل، منقطع، معضل سب کو جمع کرتا ہے۔ امام احمد وغیرہ ائمہ نے فرمایا ہم جب حلال وحرام میں روایت کرتے ہیں تو سختی کرتے ہیں اور فضائل وغیرہ کی روایت کرتے ہیں تو نرمی کرتے ہیں۔

(۵) علامہ عبدالباقی زرقانی شرح مواہب اللدنیہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

عادۃ المحدثین التساھل فی غیر الاحکام والعقائد مالم یکن موضوعاً۔

محدثین کی عادت ہے کہ احکام و عقائد کے غیر میں نرمی کرتے ہیں جب تک موضوع نہ ہو۔

(۶ تا ۱۰) مقدمہ امام ابو عمرو بن الصلاح ومقدمہ جرجانیہ وشرح الفیہ للمصنف وتقریب النواوی اور تدریب الراوی میں ہے۔ واللفظ للاخیرین.

یجوز عند اھل الحدیث وغیرھم التساھل فی الاسانید الضعیفۃ و روایۃ ماسوی الموضوع من الضعیف والعمل بہ من غیر بیان ضعفہ فی فضائل الاعمال وغیرھا ممن لا

محدثین کے نزدیک فضائل اعمال وغیرہ میں جنکو عقائد واحکام سے تعلق نہیں ضعیف سندوں میں نرمی برتنا اور موضوع کے علاوہ ہر ضعیف کو اس کا ضعف بیان کئے بغیر روایت کرنا

تعلق بہ بالعقائد والاحکام وممن نقل عنہ ذالك ابن حنبل وابن مھدی وابن المبارك قالوا اذا روینا فی الحلال والحرام شددنا واذا روینا فی الفضائل ونحوھا تساھلنا۔

اس پر عمل کرنا جائز ہے۔ جن لوگوں سے یہ منقول ہے ان میں امام احمد بن حنبل، ابن مہدی اور ابن مبارک بھی ہیں۔ ان لوگوں نے فرمایا ہے کہ ہم جب حلال و حرام میں روایت کرتے ہیں تو سختی کرتے ہیں اور فضائل وغیرہ میں نرمی برتتے ہیں۔

ان کے علاوہ نصوص کثیر ہیں۔ کتنی نقل کی جائیں۔ ناظرین انھیں بغور پڑھیں ان پر واضح ہو جائے گا کہ ائمہ سیر کیساتھ ساتھ جملہ محدثین کا اس پر اجماع ہے کہ عقائد و احکام چھوڑ کر سیر، مغازی، فضائل و مناقب میں موضوع کے علاوہ ہر قسم کی روایت مقبول و مستند ہے۔ سیر و مغازی کا جو معیار رہے اس کے لحاظ سے روایاتِ ضعاف بھی اس باب میں حجت ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ فنِ سیرت ہی سرے سے غیر معتبر اور غیر مستند ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ سیر و مغازی میں جن امور کو بیان کرنا مقصود ہوتا ہے ان کا اثبات، احادیثِ متواترہ یا مشہورہ یا صحاح یا حسان ہی پر موقوف نہیں بلکہ یہ امور صحاح و حسان کے علاوہ ان روایات سے بھی ثابت ہو جاتے ہیں جنھیں محدثین اپنی اصطلاح میں ضعیف کہتے ہیں۔ کیونکہ ضعیف کے معنی یہ نہیں کہ وہ جھوٹی روایت ہے۔ اور من گھڑت کہانی ہے۔ روایت ضعیفہ کے معنی صرف یہ ہیں کہ باعتبار اصطلاح، روایت کو صحیح و حسن کہنے کے لئے جس درجہ اور جن شرائط کے مستجمع راوی درکار ہیں اس کے راوی اس اعلیٰ درجہ کے نہیں۔ اس کا ماحصل صرف یہ ہے کہ صحیح اور حسن سے جس اعلیٰ درجہ کا صدق حاصل ہوتا ہے۔ روایت ضعیف سے اس اعلیٰ درجہ کا صدق نہیں حاصل ہوتا۔ صدق جس طرح صحیح اور حسن سے حاصل ہوتا ہے۔

ضعیف سے بھی حاصل ہوتا ہے۔ اگرچہ درجہ میں اس سے کم ہوتا ہے اور فن سیر میں جس درجہ کا صدق درکار ہے۔ وہ ضعیف سے حاصل ہوجاتا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔

مدعا جس حیثیت کا ہوتا ہے اس حیثیت کی دلیل کی حاجت ہوتی ہے ایک وہ مدعا ہے جو اعلیٰ درجہ کا ہے۔ جیسے عقائد کے وہ مسائل جو مدار کفر و ایمان ہیں۔ ان کے ثبوت کے لئے ایسی قطعی دلیل کی حاجت ہے۔ جس میں شک و شبہہ کی ذرا بھی گنجائش نہیں۔ اس باب میں احادیث آحاد اگرچہ صحیح ہوں اگرچہ صحیحین کی ہوں حجت نہیں۔ یہاں صرف قرآن مجید اور احادیثِ متواترہ حجت ہیں۔

دوسرے وہ مدعا جو اوسط درجے کا ہے جیسے حلت و حرمت۔ اس کا ثبوت ایسی قطعی دلیل پر موقوف نہیں تاہم اس کے ثبوت کے لئے ایسی دلیل ضروری ہے جو مفید ظنِ غالب ہو۔ اس کے لئے احادیث صحیحہ و حسنہ اگرچہ وہ آحاد ہوں کافی ہیں اگرچہ وہ صحیحین میں نہ ہوں اگرچہ وہ صحاحِ ستہ میں نہ ہوں۔

تیسرے وہ مدعا جو اس سے بھی ادنیٰ ہے۔ اس کا ثبوت نہ دلیل قطعی پر موقوف نہ ایسی مرجح الصدق دلیل پر جو رُواۃ کے اعلیٰ درجہ کے ثقہ اور عادل اور سند کے اتصال اور عللِ قادحہ سے خالی ہوئے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ جیسے کسی مُعزّز فی الدین انسان یا محمود عند الشرع فعل کی مخصوص یا غیر مخصوص فضیلت کا ثبوت یہ احادیث صحیحہ حسنہ کے علاوہ ضعاف سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ البتہ موضوع یہاں بھی ناقابلِ قبول ہے۔ موضوع حدیث ہی نہیں کسی بدطینت انسان کی من گھڑت ہے۔

اب آیئے ہم اور آپ غور کریں کہ سیر کے جزئیات کا درجہ ان تینوں میں کس درجہ پر ہے جو بھی عاقل منصف غور کرے گا وہ اسی نتیجہ پر پہنچے گا۔ کہ اس کا مقام تیسرا ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ جزئیاتِ سیر و مغازی کا انکار

نہ کفر ہے نہ موجب اثم۔ اسلئے ابواب مغازی وسیر میں تیسرے درجہ کی روایات جنھیں ضعیف کہتے ہیں مستند ہیں۔ جس طرح واجبات و مکروہات کے اثبات کے لئے آیات قرآنیہ یا احادیث متواترہ تلاش کرنا تکلیف مالا یُکَلَّف اور اصول شرع سے نابلدی ہے۔ اسی طرح مغازی وسیر، فضائل ومناقب کے لئے احادیث صحیحہ مُتَّصِلہ کی تحدید اپنے اوپر شدّتِ بیجا لازم کرنا اور اصول دین سے بے خبری ہے۔

ضعیف اور موضوع کا فرق

اب جبکہ دلائل عقلی ونقلی سے ثابت ہو چکا کہ سیر ومغازی میں موضوع کے علاوہ ہر قسم کی روایات مقبول ہیں تو یہ بھی ضروری ہوا کہ اس کی بھی توضیح کرتے چلیں کہ موضوع اور ضعیف میں فرق کیا ہے۔ اس کی ضرورت یوں اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حضرت علامہ اور ان کے مقلّدین جس روایت کو رد کرنا چاہتے ہیں اس پر اتنی جرح کافی سمجھتے ہیں کہ کسی نے اس کے بارے میں یہ کہہ دیا ہو۔ یہ صحیح نہیں۔ یہ ثابت نہیں۔ اس کا رفع ثابت نہیں۔ یہ شاذ ہے۔ منکر ہے۔ متروک ہے اس سے ان عوام میں جو محدثین کی اصطلاح سے واقف نہیں۔ یہ غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے۔ کہ غالباً یہ سب موضوع کی تعبیرات ہیں۔

موضوع اگرچہ ضعیف ہی کی قسم ہے مگر کتب قوم میں یہ دونوں بحیثیت قسیم مستعمل ہیں۔ جیسے عرف عام میں انسان اور حیوان کہ اگرچہ حقیقت میں انسان، حیوان کی ایک نوع ہے مگر عرف عام میں دونوں متقابل معنوں میں بولے جاتے ہیں۔ اس لئے اثبات ضعف سے اثبات وضع لازم نہیں۔ یوں ہی کسی حدیث کے بارے میں محدثین کے اس کہہ دینے سے کہ یہ "صحیح نہیں" حدیث کا موضوع ہونا تو درکنار ضعیف ہونا بھی لازم نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ حسن ہو بلکہ بعض ائمۂ نقد نے "لَا یَصِحُّ" کو عدم وضع کی دلیل بتایا۔

اس کی تفصیل یہ ہے۔
صحیح ان کی اصطلاح میں اس حدیث کو کہتے ہیں جس کے تمام رُواۃ کا اعلیٰ درجہ کا حفظ و ضبط پر فائز ہونا ثابت ہو۔ اس کی سند متصل اور علت شذوذ و نکارت سے خالی ہو۔ ان تمام شرائط کا اجتماع اور اس کے خلاف کا ارتفاع بہت کم ہوتا ہے۔ پھر ان شرائط کے اثبات میں بڑی دشواریاں ہیں محدثین ان شرائط میں جہاں کچھ کمی دیکھتے ہیں فرمادیتے ہیں یہ حدیث صحیح نہیں۔ اس کا حاصل صرف یہ ہے کہ صحیح ہونے کے لئے جن جن شرائط کی ضرورت ہے وہ سب اس میں موجود نہیں۔ صحیح کے بعد حسن کا درجہ ہے۔ "لَایَصِحُّ" کا مطلب کبھی یہ ہوتا ہے کہ یہ حسن ہے۔ حسن وہ حدیث ہے جس میں صحیح ہونے کے بعض شرائط میں وہ معیار نہ پایا جائے جو صحیح ہونے کے لئے ضروری ہے فی نفسہ اس میں کوئی نقص نہیں ورنہ حسن نہ کہلاتی۔ ناقص کہلاتی۔ حدیث حسن میں جو تنزّل ہے وہ اگر کسی طرح مُنجَبِر ہو جائے تو اسے صحیح لغیرہ کہتے ہیں۔ حدیث حسن سِیَر و فضائل کے علاوہ احکام میں بھی حجت ہے۔
حسن کے بعد ضعیف کا درجہ ہے۔ اسکی تعریف یہ ہے کہ حدیث صحیح و حسن میں جو شرائط معتبر ہیں ان میں سے کل یا بعض مفقود ہوں۔ اس کا تین درجہ ہے۔ ضعیف بہ ضُعفِ اخف جس میں راوی پر اختلاط و سوء حفظ جیسے ہلکے طعن ہوں۔ پھر ضعیف بہ ضُعفِ خفیف جیسے فسق و کذب وغیرہ شدید جرحوں سے راوی مطعون ہو۔ تیسرے ضعیف بہ ضعف شدید کہ اصلاً حدیث ہی نہ ہو۔ بلکہ کسی بیباک کی من گھڑت ہو یہی موضوع ہے۔
ضعیف بہ ضعفِ اخف جابر سے قوت پاکر حسن لغیرہ بلکہ صحیح لغیرہ کی منزل تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ کل سات قسمیں ہوئیں۔ صحیح لذاتہ[1]، صحیح لغیرہ[2]، حسن لذاتہ[3] حسن لغیرہ[4]، ضعیف[5] بہ ضعف اخف۔ ضعیف[6] بہ ضعف خفیف۔ موضوع[7]
پہلی چار قسمیں احکام سیر و مغازی و فضائل و مناقب سب میں لائق

احتجاج ہیں۔ پانچویں قسم شواہد ومتابعات وغیرہ میں مقبول اور جابر سے قوت پاکر حسن لغیرہ یا صحیح لغیرہ کے رتبہ کو پہنچ جائے تو احکام میں بھی معتمد۔ چھٹی قسم احکام میں غیر مقبول مگر سیر ومغازی وفضائل ومناقب میں بالاجماع مستند۔

ساتویں قسم نہ حدیث نہ اس کا کہیں اعتبار۔ ہر منصف فیصلہ کرے کہ "لا یصح" کہنے سے صحیح کی نفی ہوئی۔ صحیح اور موضوع کے مابین پانچ قسمیں ہیں۔ یہ کسی عاقل کی سمجھ میں آسکتا ہے کہ اعلیٰ کی نفی سے سب سے ادنیٰ کا اثبات ہوگیا۔ اسی بنا پر علما نے تصریح کی ہے۔

بین قولنا لا یصح وبین قولنا موضوع بون کبیر فان الوضع۔ اثبات الکذب والاختلاق وقولنا لم یصح لا یلزم منہ العلم انما ھو اخبار عن عدم الثبوت وفرق بین الامرین۔ (کتاب النکت علی ابن الصلاح للعلامۃ الزرکشی، تنزیہ الشریعہ، لآلی مصنوعہ، خاتمۃ مجمع بحار الانوار)

ہمارے ان دونوں قول میں یہ صحیح نہیں اور یہ موضوع ہے۔ بہت بعد ہے۔ اسلئے کہ وضع جھوٹ اور من گھڑت ثابت کرنا ہے۔ اور ہمارے اس کہنے سے کہ صحیح نہیں، حدیث نہ ہونا لازم نہیں یہ تو صرف عدم ثبوت بتاتا ہے اور دونوں میں بہت فرق ہے۔

اسی عبارت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ محدثین کے یہ فرمانے سے کہ ثابت نہیں۔ ثبوتِ وضع نہیں ہوتا۔

حلیہ شرح منیہ میں ہے۔

قول الترمذی لا یصح من النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فی ھذا الباب شیٔ انتھی لا ینفی وجود الحسن ونحوہ والمطلوب لا یتوقف ثبوتہ علی الصحیح بل کما یثبت بہ

ترمذی کا یہ فرمانا کہ اس باب میں نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کچھ صحیح نہیں یہ قول حسن کے وجود کی نفی نہیں کرتا۔ اور مطلوب کا ثبوت صرف صحیح پر موقوف نہیں بلکہ جیسے صحیح سے ثابت

یثبت بالحسن | ہوتا ہے، حسن سے بھی ثابت ہوتا ہے۔

صواعق محرقہ میں امام ابن حجر مکی فرماتے ہیں۔

قول احمد انہ حدیث لا یصح ای لذاتہ فلا ینفی کونہ حسنا لغیرہ الحسن لغیرہ یحتج بہ کما بین فی الحدیث۔

امام احمد کا یہ قول کہ یہ حدیث صحیح نہیں یعنی صحیح لذاتہ۔ یہ حسن لغیرہ کی نفی نہیں اور حسن لغیرہ حجت ہے۔ جیسا کہ علم حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔

سند الحفاظ علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ۔ اذکار امام نووی کی تخریج احادیث میں فرماتے ہیں۔

من نفی الصحۃ لا ینفی الحسن

صحت کی نفی سے حسن کی نفی نہیں ہوتی۔

موضوعات کبیر میں ہے۔

لا یصح لا ینافی الحسن

لا یصح کہنا حسن کے منافی نہیں۔

علامہ زرقانی فرماتے ہیں۔

نفیہ الصحۃ لا ینافی انہ الحسن کما علم۔

صحیح ہونے کی نفی اس کے منافی نہیں کہ وہ حسن ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے۔

ان ارشادات علما سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ حدیث حسن احکام میں بھی مستند اور لائق احتجاج ہے وہاں یہ بھی ثابت ہو گیا کہ لا یصح کہنے سے حسن کی بھی نفی نہیں ہوتی۔ چہ جائے کہ ثبوتِ وضع ہو۔ ایسا بہت ہوتا ہے کہ ناقدین یہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح نہیں اور وہ حسن ہوتی ہے۔ لا یصح سے ثبوت وضع تو بہت دور ہے۔ ادنیٰ ضعف بھی لازم نہیں۔ بلکہ بعض علما نے لا یصح کو موضوع نہ ہونے کی دلیل بتایا۔ موضوعات کبیر میں حدیث "البطیخ قبل الطعام یغسل البطن غسلا ویذھب الداء اصلاً" کے متعلق ابن عساکر کا قول "لا یصح" نقل کر کے فرماتے ہیں۔

ھو یفید انہ غیر موضوعۃ | لا یصح کہنا یہ افادہ کرتا ہے کہ یہ حدیث

کما لا یخفی۔ موضوع نہیں جیسا کہ پوشیدہ نہیں۔

ظاہر ہے کہ اگر یہ حدیث موضوع ہوتی تو صاف صاف فرما دیتے۔ یہ موضوع ہے۔ صرف "لا یصح" پر اکتفا نہیں کرتے۔

ناظرین غور کریں۔ آج کسی حدیث کے بارے میں "لا یصح" کہیں مل گیا تو بغیر یہ تحقیق کئے ہوئے کہ لا یصح کہنے والا کون ہے اور اس کا مطلب کیا ہے اور حقیقت بھی وہی ہے جو قائل نے کہی ہے یا اس کے برعکس ہے۔ حدیث کو پوری بے دردی کے ساتھ مردود و مطرود کر دیتے ہیں۔ اور خود "لا یصح" کہنے والے اس کا مطلب یہ بتا رہے ہیں کہ لا یصح کہنے سے حدیث کا ضعیف ہونا لازم نہیں۔ حدیث حسن کو بھی "لا یصح" کہہ دیتے ہیں۔ اسے مستند و معتمد بتاتے ہیں بلکہ لا یصح کو موضوع نہ ہونے کی دلیل بتاتے ہیں۔ اور یہ سخن فہم لوگ اس کا صرف یہی مطلب لیتے ہیں کہ یہ غیر مقبول ہے۔ غیر مستند ہے۔ مردود ہے مطرود ہے۔

اسی طرح آپ کو جگہ جگہ ملے گا کہ ذرا کسی روایت کے بارے میں ملا یہ مجہول ہے بس رد کر دیا۔ حالانکہ سند میں کسی راوی کا مجہول ہونا صحت حدیث میں قادح ہونا علما میں مختلف فیہ ہے۔ اور اگر ہے بھی تو صرف اس حد تک کہ مُورِثِ ضُعف ہے نہ کہ مُوجِبِ وضع۔ اس کی توضیح یہ ہے: مجہول کی تین قسمیں ہیں مستور، مجہول العین، مجہول الحال۔

۱۔ مستور وہ ہے جس کی عدالت ظاہری معلوم ہو، باطنی کی تحقیق نہ ہو۔
۲۔ مجہول العین وہ ہے جس سے صرف ایک شخص نے روایت کی ہو۔
۳۔ مجہول الحال۔ وہ ہے جس کی عدالت ظاہری اور باطنی کسی کی تحقیق نہ ہو۔

مستور کی روایت جمہور محققین کے نزدیک مقبول ہے۔ اور قطعاً مُخِلِّ صحت نہیں چنانچہ صحیح مسلم میں اس قسم کے راویوں کی کثیر روایتیں موجود

ہیں۔ فتح المغیث میں ہے

قبلہ ابوحنیفۃ خلافا للشافعی

مستور کی روایت امام ابوحنیفہ نے قبول فرمائی۔ امام شافعی کا اس میں اختلاف ہے۔

امام نووی نے اس کی تصحیح فرمائی۔

امام عمرو بن الصلاح نے اس کو مختار فرمایا یعنی مستور کی روایت کے مقبول ہونے کو۔

مجہول الحال کو بھی بعض اکابر لائق حجت جانتے ہیں۔ البتہ جمہور محدثین اس کو ضعیف مانتے ہیں۔ بلکہ امام نووی نے مجہول العین کے بھی مقبول ہونے کو محققین کی طرف منسوب کیا۔ مقدمہ منہاج میں فرماتے ہیں۔

المجھول اقسام مجھول العدالۃ ظاھرا وباطنا ومجھولھا باطنا مع وجودھا ظاھرا وھو المستور ومجھول العین فاما الاول فالجمھور علی انہ لایحتج بہ واما الاخران فاحتج بھما کثیرون من المحققین۔

مجہول کی چند قسمیں ہیں۔ ایک وہ جسکی عدالت ظاہری و باطنی دونوں نامعلوم ہو۔ دوسرے وہ کہ عدالت ظاہری معلوم ہو باطنی نامعلوم ہو۔ یہ مستور ہے۔ تیسرے مجہول العین۔ اول تو جمہور کے نزدیک لائق احتجاج نہیں۔ رہ گئے اخیرین تو اکثر محققین اس سے احتجاج کرتے ہیں۔

عارف باللہ امام ابوطالب مکی نے اسی کو اولیاء کرام اور فقہا کا مسلک بتایا۔ قوت القلوب میں فرماتے ہیں۔

بعض ما اضعف بہ رواۃ الحدیث وتعلل بہ احادیثھم لایکون تعلیلا ولاجرحا عند الفقھاء

بعض وہ باتیں جن سے رواۃ اور احادیث کی تضعیف و تعلیل کی جاتی ہے فقہا اور اولیا کے نزدیک طعن و جرح

ولاعند العلماء باللہ تعالیٰ مثل ان یکون الراوی مجھولا لایثارہ الخمول وقد ندب الیہ و لقلۃ الاتباع لہ اذلم یقع لھم الاثرۃ عندی۔

نہیں۔ جیسے راوی کا مجہول ہونا کیونکہ اس نے گمنامی پسند کی اور یہ شریعت میں پسندیدہ بھی ہے یا اس کے تلامذہ کم ہوئے۔ اس بنا پر لوگوں کو اس سے روایت کا موقع کم ملا۔

المختصر اس میں اختلاف ہے کہ جہالت راوی سرے سے وجوہ طعن میں سے ہے بھی یا نہیں۔ اور جو لوگ اسے طعن مانتے ہیں وہ بھی صرف مُورِثِ ضعف بتاتے ہیں۔ مُوجِبِ وضع کوئی نہیں کہتا۔ بلکہ اگر کسی نے جہالتِ راوی کی بنا پر حدیث کو موضوع کہا تو علماء نے اس کی تردید فرمائی۔

امام بدرالدین زرکشی نے پھر آلی مصنوعہ میں فرمایا۔

لو ثبتت جھالتہ لم یلزم ان یکون الحدیث موضوعا مالم یکن فی اسنادہ من یُتَّھَمُ بالوضع

اگر مجہول ہونا ثابت بھی ہو جائے تو اس سے حدیث کا موضوع ہونا لازم نہیں آتا۔ جب تک اسکی اسناد میں کوئی مُتہَم بالوضع نہ ہو۔

علامہ زرقانی فرماتے ہیں۔

قال السھیلی فی اسنادہ مجاھیل وھو یفید الضعف فقط

سہیلی نے کہا اس کی سند میں مجہول ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ ضعیف ہے اور بس۔

یوں ہی راوی پر جن وجوہ سے طعن ہوتا ہے۔ ان میں کذب و وضع کے علاوہ جتنے وجوہ ہیں۔ سب زیادہ سے زیادہ مورثِ ضعف ہیں مُثبتِ وضع صرف کذب ہے کہ معاذاللہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھا۔ جس بے باک نے ایک دفعہ بھی عمر میں یہ جرأت کی مدۃ العمر اسکی حدیث مقبول نہ ہوگی۔ اگرچہ توبہ کرلے۔ کذب کے علاوہ تمام طعن سوئے

حفظ، بدعت، جہالت، مخالفتِ ثقات، وہم، فسق، غفلت، کثرتِ غلط حتیٰ کہ تہمتِ کذب تک سے وضع پر استدلال فاسد، یونہی حدیث میں طعن کے جتنے وجوہ ہیں مثلاً اضطراب اور ادراج، تدلیس، نکارت، شذوذ، ارسال، انقطاع وغیرہ سب کی حد یہ کہ حدیث ضعیف ہوگی۔

پھر ناقدین میں سے بعض بعض بہت متشدد اور مُفرط ہوئے ہیں۔ ان کا طعن، ان کا حکمِ وضع لائق اعتبار نہیں، مثلاً ابن جوزی، ابن تیمیہ ابن قیم وغیرہ۔

ابن جوزی کے بارے میں علما متفق ہیں کہ یہ حدیث کو موضوع کہنے میں بہت جلد باز ہیں۔ کتنی صحیح احادیث کو موضوع کہہ دیا ہے حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مقدمہ اشعۃ اللمعات میں فرماتے ہیں۔

ابن جوزی راکتابے ست در موضوعات حدیث کہ افراط کردہ است درانجا درنسبت وضع باحادیث وحکم کردہ است بر بسیارے از احادیث بمجرد توہم ومخالفت انچہ نزد وے بود از علم وشیخ ابن حجر عسقلانی در بسیارے از مواضع بروے بحث کردہ وگفتہ اعتماد نیست بروے درنسبت وضع باحادیث۔

ابن جوزی کی موضوعات حدیث میں ایک کتاب ہے اس کتاب میں احادیث کو موضوع کہنے میں بہت غلو کیا ہے۔ اور بہت سی احادیث کو محض وہم کی بنا پر موضوع کہہ دیا۔ اور بہت کو اس بنا پر کہ انھیں جو معلوم تھا اس کے مخالف تھیں۔ شیخ ابن حجر عسقلانی نے بہت جگہ اس پر بحث کی ہے۔ اور فرمایا کہ ابن جوزی کے کسی حدیث کو موضوع کہنے کا اعتبار نہیں۔

ان سے کئی ہاتھ آگے ابن تیمیہ اور ابن قیم ہیں۔ علمائے محتاطین بھی بہرحال انسان تھے۔ انھوں نے ہزاروں چھان بین تحقیق و تفتیش کے بعد کسی حدیث کو موضوع کہا مگر بھول چوک کس سے نہیں ہوتی، اس لئے

کسی کا کسی حدیث کو موضوع کہنا اور بات ہے۔ اور واقع میں اس کا موضوع ہونا اور بات ہے۔ جہاں حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنا استحقاقِ نار کا موجب ہے۔ وہاں قولِ رسول کو یہ کہنا کہ یہ قولِ رسول نہیں اسی درجے کا جرم ہے کہ درحقیقت یہ بھی جھوٹ باندھنا ہے۔ اس کو یوں سمجھئے کہ غیر قرآن کو قرآن کہنا اور قرآن کے کسی جز کو قرآن نہ ماننا دونوں یکساں طور پر کفر ہیں۔ یوں ہی غیر حدیث کو حدیث کہنا اور حدیث کو حدیث نہ ماننا ایک درجہ پر ہے۔ اس لئے کسی حدیث کو موضوع کہنے میں جلدی کرنا عند الشرع محمود نہیں —— اس بارے میں بڑی احتیاط کامل تتبع اور استقصا کے بعد ہی کسی حدیث کے بارے میں یہ حکم لگایا جاسکتا ہے کہ یہ موضوع ہے۔ یہ بھی بر سبیلِ ظن، یہاں یقینی حکم بہت مشکل ہے۔ فان الکذوب قد یصدق۔ حضرت شیخ مقدمہ اشعۃ اللمعات میں فرماتے ہیں۔

وحکم بوضع وافترا، بحکم ظن غالب است و قطع و یقین را بداں راہ نیست فان الکذوب قد یصدق	وضع و افترا کا حکم ظن غالب سے ہے قطعی یقین کی یہاں کوئی صورت نہیں اسلئے کہ پکا جھوٹا بھی کبھی سچ بولتا ہے۔

اور حقیقت میں یہ کام ہمارا آپ کا نہیں علمائے محدثین نے ہمیں اس سے مستغنی فرما دیا۔ اس راہ میں سوائے ان کی تقلید کے کوئی چارہ نہیں۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ ایک ناقد نے کسی ایک سند کو سامنے رکھ کر ایک حدیث کو موضوع یا ضعیف کہا، مگر اسی حدیث کی ایک یا زیادہ سندیں ایسی ہوتی ہیں، جن میں خلل نہیں ہوتا اور اس سند سے وہ حسن یا صحیح ہوتی ہے۔ اس لئے اگر کسی ناقد نے کسی حدیث کو موضوع یا ضعیف کہا ہے تو آنکھ بند کر کے اس پر یقین کرنا درست نہیں۔ دوسرے ناقدین کی رائیں اور دوسرے طرق تلاش کرنا ضروری ہے۔ اگر مل جائیں تو اسکے مطابق

فیصلہ کرنا چاہئے۔

مثلاً ایک طریقے سے وہ موضوع ہے۔ مگر دوسرے طریقے سے صحیح یا حسن ہے تو اس کو صحیح یا حسن ہی مانیں گے۔ یہ نہیں کہ دوسرے طریقوں کے ہوتے ہوئے جو وضع وقدح سے خالی ہیں اس کو موضوع ہی کہیں یوں ہی کسی ناقد نے کسی حدیث کو موضوع کہا دوسرا اس کو صحیح یا حسن کہتے ہیں یا ضعیف کہتے ہیں۔ تو دونوں ناقدین کی حیثیت، رتبہ، امت میں اعتبار و اعتماد، دلائل و قرائن کی قوت پر فیصلہ ہوگا۔ یہ نہیں کہ بس جب فلاں نے موضوع کہہ دیا تو وہ موضوع ہی ہے۔ خواہ ساری امت اسے حدیث مانے، اسے قبول کرلے۔ یہ وہ اہم اور لطیف نکتے ہیں جن سے غفلت کی وجہ سے لوگ قدم قدم پر ٹھوکریں کھارہے ہیں۔ اور امت میں انتشار وافتراق کے باعث بنتے ہیں۔

خلاصہ ابحاث

ہماری اس کتاب میں مندرجہ ذیل امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے جنھیں تفصیل کے ساتھ اوپر بیان کر آئے۔

۱۔ سیر و مغازی فضائل و مناقب کے وہ ابواب جو قطعی نہیں ان میں علاوہ موضوع کے ہر حدیث اور ہر روایت مستند ہے۔ اسی پر تمام امت اور علما سیر و مغازی کا عمل ہے

۲۔ عقائد و احکام میں البتہ موضوعات کے ساتھ ضعاف بھی غیر معتمد ہیں۔ اگرچہ وہ سیر و فضائل کا جزء ہوں

۳۔ جب تک علما معتدین و محتاطین جن پر امت کو اطمینان ہے یہ تصریح نہ کریں کہ یہ حدیث موضوع یا ضعیف ہے کسی غیر محتاط متغالی یا متہوّر کے موضوع کہدینے سے موضوع نہ ہوگی۔

۴۔ کسی حدیث یا روایت پر کسی محدّث کا طعن اسکے ساقط الاعتبار ہونے کے لئے کافی نہیں۔ جب تک کہ اس کی مکمل چھان بین نہ کر لی جائے۔

۵۔ لایصح۔ لایثبت صحیح نہیں۔ ثابت نہیں۔ مجہول ہے۔ شاذ ہے۔ منکر ہے۔ منقطع ہے۔ مرسل ہے۔ مدلس ہے۔ معضل ہے۔ مضطرب ہے۔ مدرج ہے۔ معلل ہے۔ غریب ہے۔ اس قسم کی اور جرحیں سیر و مغازی و فضائل و مناقب میں مستند ہونے میں مخل نہیں۔ بلکہ ان میں سے بعض احکام میں بھی معتمد ہیں۔

۶۔ ہاں تعارض کے وقت کتاب اللہ پھر احادیث صحاح حسان کو ہمیشہ ترجیح ہوگی۔

۷۔ روایت مقبولہ کے ہوتے ہوئے محض اپنی رائے اور قیاس سے مزاحم ہونے کی وجہ سے کسی مروی کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ ہماری عقل خواہ کتنا ہی ابا کرے۔

نسب نامہ

شَجَرَۃٌ طَیِّبَۃٌ اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُھَا فِی السَّمَآءِ

محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) بن عبداللہ، بن عبدالمطلب، بن ہاشم، بن عبدمناف، بن قصی، بن کلاب، بن مرہ، بن کعب، بن غالب، بن فہر، بن مالک، بن نضر، بن کنانہ، بن خزیمہ، بن الیاس، بن مضر، بن نزار، بن معد، بن عدنان۔

عدنان تک سلسلہ نسب متفق علیہ ہے اس لئے علماء محتاطین نے اسی پر اکتفا فرمایا ہے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنا نسب پاک عدنان تک بیان فرما کر خاموش ہو جاتے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ حضرت آدم تک سلسلۂ نسب بیان کرنے والوں کے خلاف اس آیت سے استدلال کرتے۔

اَلَمْ یَاْتِکُمْ نَبَؤُا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ وَالَّذِیْنَ مِنْۢ بَعْدِھِمْ لَا یَعْلَمُھُمْ اِلَّا اللہُ (ابراہیم پ ۱۳)

کیا تم لوگوں کے پاس ان لوگوں کی خبر نہیں آئی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں جیسے قوم نوح عاد، ثمود اور ان کے بعد کی اقوام جن کو سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں جانتا۔

اور فرمایا کرتے تھے کذب النسابون، نسّاب جھوٹے ہیں۔ یوں ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عدنان تک تو معلوم ہے آگے کا پتہ نہیں حضرت عمر فرماتے ہیں کہ مجھے کوئی ایسا نہیں ملتا جو عدنان کے آگے سلسلۂ نسب جانتا ہو۔

ایک شخص اپنا نسب نامہ حضرت آدم تک بیان کرتا تھا اس کے بارے میں امام مالک رضی اللہ عنہ سے جب سوال کیا گیا تو امام مالک نے فرمایا کہ اس کو کس

نے بتایا ہے۔ حضرات انبیا علیہم السلام کے نسب کو حضرت آدم علیہ السلام تک پہنچانے سے امام مالک نے بھی منع فرمایا ہے۔

ظاہر ہے کہ حضرت آدم تک تمام اشخاص کے نام معلوم کرنے میں کوئی خاص فائدہ نہیں اور اختلافات کی کثرت کی وجہ سے ناموں میں خلط ملط اور ردوبدل کا قوی اندیشہ ہے لہذا ہمیں بھی عدنان پر اکتفا کرنا چاہیئے، البتہ علمار انساب کا اس پر اتفاق ہے کہ آبار کرام میں عدنان کے آگے حضرت اسمٰعیل، حضرت ابراہیم حضرت نوح، حضرت ادریس، حضرت شیث، حضرت آدم بالضرور ہیں۔ سَلَامُ اللّٰہِ عَلَیۡھِمۡ اَجۡمَعِیۡنَ

"عدنان" سے حضرت اسمٰعیل تک امام بخاری نے اپنی تاریخ میں چھ علامہ عینی نے شرح بخاری میں آٹھ، کسی نے سات، کسی نے پندرہ، کسی نے اٹھیس کسی نے تیس نام گنائے ہیں۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ درمیان میں چالیس پشت ہے۔

اسی طرح "روضۃ الاحباب" کے حاشیہ میں "ابن جوزی" کی کتاب "انساب" سے نقل کیا ہے کہ عدنان سے اوپر حضرت آدم تک صرف تیس پیڑھیاں ہیں لیکن یہ بھی صحیح نہیں۔ اس لئے کہ علامہ "سہیلی" نے "روض الانف" میں تحریر فرمایا ہے کہ عدنان اور حضرت اسمٰعیل کے مابین جو زمانہ ہے وہ اتنا طویل ہے کہ اس میں کسی طرح چالیس پشت سے کم نہیں ہو سکتی۔ یوں ہی علامہ طبری نے تحریر کیا ہے کہ بعض نسب دانوں سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ بعض علمار نسب نے معد سے حضرت اسمٰعیل تک چالیس نام گنائے ہیں اور وہ اس کی تائید عرب کے اشعار سے کرتے ہیں اور اہل کتاب کی تحقیق بھی یہی ہے، علامہ موصوف ابو یعقوب نامی ایک نومسلم یہودی تدمر کے باشندے کا بیان نقل کرتے ہیں کہ میرے پاس ایک نسب نامہ ہے جو ارمیا پیغمبر کے منشی کا تحریر کردہ ہے۔ اس میں بھی عدنان سے حضرت اسمٰعیل تک چالیس پشت ہے۔ تو یہ کیسے باور کیا جائے کہ عدنان سے حضرت آدم تک تیس ہی پشت ہے۔ عدنان کے نسب نامہ میں اتنی کمی بیشی

اس وجہ سے ہے کہ اہلِ عرب عدنان تک نسب علی الاتصال پہنچاتے تھے۔ اور عدنان کا حضرت اسمٰعیل کی اولاد سے ہونا۔ چونکہ امر مسلم تھا۔ اس لئے عام طور پر اوپر جاکر مشہور مشہور نام گنا دینا کافی سمجھتے ہیں۔

عام نسب ناموں میں چونکہ عدنان سے حضرت اسمٰعیل تک صرف آٹھ نو نام ہیں اور زمانہ بہت طویل ہے۔ اس لئے بعض عیسائیوں نے اس سے انکار کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابراہیم کی نسل سے ہیں۔

لیکن اس کے برخلاف بیسیوں یورپین اور یہودی مورخین اس پر متفق ہیں کہ قریش بلکہ تمام شمالی عرب و حجاز حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اولاد ہیں۔ چونکہ تمام آباء کرام کے احوال معلوم نہیں۔ اس لئے صرف مشاہیر کے احوال قلم بند ہوں گے۔ وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ

ابوالانبیاء سیدنا ابراہیم علیہ السلام

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ

تمہارے باپ ابراہیم کی ملت انھوں نے ہی پہلے تمہارا نام مسلمان رکھا۔

حضرت آدم کے تین ہزار تین سو تیئیس سال اور طوفان نوح کے ایک ہزار دو سو پینتالیس سال بعد عراق عجم کے مشہور شہر بابل میں نمرود بن کنعان کی زبردست سلطنت قائم تھی۔ اس مغرور نے اپنی شاہانہ تمکنت کے زعم میں خدائی کا دعویٰ کر دیا تھا۔ اللہ العالمین نے اپنی خدائی میں شرکت کے مدعی کی سرکوبی کے لئے اپنے خلیل ابوالانبیاء سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو مبعوث فرمایا۔

ولادت

حضرت ابراہیم کی ولادت سے قبل نمرود نے خواب دیکھا کہ ایک ستارہ ایسا طلوع ہوا ہے جس کی تابش کے آگے شمس و قمر ماند پڑ گئے ہیں۔ اس نے

اپنے دربار کے نجومیوں سے اس خواب کی تعبیر پوچھی۔ انھوں نے بتایا کہ تیری قلمرو میں ایک ایسا لڑکا پیدا ہوگا جو تیری حکومت کو برباد کر ڈالے گا۔ اس تعبیر کے سننے کے بعد اس نے اپنی پوری حدود سلطنت میں حکم نافذ کر دیا کہ تمام نومولود بچے قتل کر دیئے جائیں اور لوگ عورتوں سے الگ رہیں۔ اور ایک محکمہ قائم کر دیا جو اس کی دیکھ بھال کرے۔

قدرت ایزدی کہ جب ابراہیم علیہ السلام بطن مادر میں قرار پائے تو ان کی والدۂ محترمہ کی عمر شریف کم تھی۔ ان کی طرف کسی کا ذہن نہ گیا۔ حمل پہچانا نہ جاسکا۔ آپ کے والد محترم نے ایک تہ خانہ شہر کے باہر کھود رکھا تھا ولادت کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی والدہ اسی تہ خانے میں چلی گئیں۔ اللہ کا خلیل اسی تہ خانے میں اس ظلمت کدۂ عالم کو روشن کرنے کے لئے تشریف لایا۔ سلام اللہ علیہ وصلوٰتہ۔

حضرت ابراہیم اسی تہ خانہ میں رہتے۔ آپ کی والدۂ ماجدہ روزآنہ جاکر دودھ پلا آتیں اور تہ خانے کو پتھر سے بند کر دیتیں۔ آپ کی والدہ جب جاتیں تو آپ کو انگلی کا سرا چوستے پاتیں اور ملاحظہ کرتیں کہ انگلیوں سے دودھ جاری ہے۔ حضرت ابراہیم کی نشوونما غیر معمولی تھی۔ عادتاً بچے سال بھر میں جتنا بڑھتے آپ ایک مہینہ میں بڑھتے۔

انبیاء علیہم السلام اپنی ابتدائے ہستی سے معصوم اور عارف باللہ ہوتے ہیں۔ اسی کے زیر اثر ایک دن آپ نے اپنی والدہ سے پوچھا۔ میرا رب کون ہے؟ انہوں نے سمجھا پرورش کرنے والے کو پوچھتے ہیں۔ جواب دیا۔ میں۔ پھر حضرت ابراہیم نے پوچھا۔ اور تمھارا رب کون ہے۔ جواب دیا۔ تمھارے والد۔ پھر دریافت کیا۔ اور ان کا رب کون ہے۔ اب والدۂ محترمہ لاجواب ہوگئیں۔ اس کا تذکرہ انکے والد سے کیا اور بتایا کہ جس بچے کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ سب کا دین بدل دے گا وہ یہی ہے۔

"بابل" میں بت پرستی کے ساتھ ساتھ ستارہ پرستی کا رواج عام تھا۔ حضرت ابراہیم کی بعثت کا بنیادی مقصد غیر اللہ کی پرستش کی بیخ کنی تھی۔ اس لئے ابتدا ہی سے آپ کے قلب پاک پر غیر اللہ کی الوہیت کے بطلان کے دلائل فائض ہونے لگے۔

تہ خانہ میں آپ نے کسی دن زہرہ یا مشتری کو چمکتے ہوئے ملاحظہ فرمایا قوم کے اعتقاد پر طنز کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ یہ میرا رب ہے؟ لیکن جب یہ ستارہ ڈوب گیا تو فرمایا میں ڈوبنے والوں سے رشتہ محبت نہیں رکھتا۔ پھر جب چاند نکلا اور اس کی چمک دمک دیکھی تو فرمایا یہ میرا رب ہے؟ پھر جب وہ بھی غروب ہو گیا تو فرمایا اگر میرا رب ہدایت نہ دیتا تو میں انھیں گمراہوں کے زمرے میں داخل ہوتا۔ پھر جب سورج کو جگمگاتے ہوئے دیکھا تو فرمایا (اچھا) یہ میرا رب ہے؟ یہ ان سب سے بڑا ہے۔ لیکن جب ستارہ پرستوں کا یہ سب سے بڑا دیوتا بھی زرد رو ہو کر ڈوب گیا اور ان احمقوں کے پاس اب کوئی ایسا نہ رہا جسے حضرت ابراہیم کے سامنے پیش کرتے۔ تو آپ نے نہایت اطمینان کے ساتھ فرمایا۔ اے قوم میں تمہارے معبودوں سے بیزار ہوں۔ میں نے سب سے اپنا منھ موڑ کر اسکی طرف پھیر لیا جس نے زمین و آسمان بنائے اور میں مشرک نہیں ہوں۔

حضرت ابراہیم کی بیان فرمودہ یہ وہ برہان قاطع ہے۔ جو ہزار ہا سال سے آج تک لاجواب ہے۔ آج کی فلسفی اور سائنسی دنیا کے پاس بھی اس کا کوئی جواب نہیں۔

حضرت ابراہیم علی الاختلاف ۷، ۱۳، ۱۷، برس تہ خانہ میں رہے۔

تبلیغ توحید

تہ خانہ سے باہر نکلے تو دیکھا کہ ان کا پرورش کنندہ چچا آزر بت تراش اور پوری قوم بت پرست اور ستارہ پرست ہے۔ دوسری طرف نمرود خدائی کا دعویٰ دار ہے۔ قوم کی اس گمراہی کو دیکھ کر خلیل اللہ کا دل تڑپ اٹھا۔ چچا آزر سے کہا۔ یہ کیا حماقت ہے کہ رب العلمین کو چھوڑ کر ان بتوں کو معبود بتاتے ہو۔ اور قوم سے سوال کیا یہ کیسی مورتیاں ہیں

جن کے آگے آسن جمائے رہتے ہو۔ ان سفہا کے قلوب میں ان مورتیوں کی الوہیت کا ڈھونگ ایسا رچا ہوا تھا کہ انھیں اس کا وہم بھی نہ تھا کہ کوئی اس سے منکر ہوسکے گا۔ جب اس مردِ حق آگاہ کا سوال سنا تو بوکھلا گئے اور بولے ہم کچھ نہیں جانتے، ہم نے اپنے آباء واجداد کو ان کی پوجا کرتے دیکھا ہے۔ ہم بھی کر رہے ہیں۔ حضرت ابراہیم نے نعرۂ حق بلند فرمایا "تم اور تمھارے بت پرست آباء واجداد سب گمراہ تھے، قوم کی جرأت اور بڑھی پوچھا اے ابراہیم تم واقعی بات کہتے ہو یا مذاق کرتے ہو۔ حضرت ابراہیم نے جواب دیا یہ مذاق نہیں واقعہ ہے۔ تم سب کا رب وہی ہے جو آسمانوں اور زمینوں کا رب ہے۔ جس نے انھیں بنایا ہے۔ اور میں اس پر گواہ ہوں۔

بت شکنی

اہل بابل کا ایک سالانہ میلہ لگتا تھا۔ میلہ جانے سے پہلے یہ بتوں کو سنوارتے سجاتے اور ان کے سامنے عمدہ عمدہ کھانے رکھ جاتے، دن بھر میلہ میں رنگ رلیاں مناتے اور واپسی پر ان کھانوں کو بطور پرشاد کھاتے، اتفاق کی بات حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سابقہ گفتگو کے ایک دن بعد میلہ تھا، ان لوگوں نے کہا۔ کہ کل عید ہے۔ تم بھی عیدی میلہ کی بہار دیکھنے چلو۔ حضرت ابراہیم نے ستاروں پر ایک نظر ڈالی اور "اِنِّیْ سَقِیْمٌ" فرمایا میں بیمار ہونے والا ہوں۔

قوم علم نجوم کی بڑی معتقد تھی۔ اس نے سمجھا کہ شاید اسی علم سے انھیں اپنے بیمار ہونے کا علم ہوچکا ہے۔ اس لئے وہ لوگ آپ کو چھوڑ کر میلہ میں چلے گئے۔ جب یہ لوگ میلہ میں جانے لگے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔ تم لوگ جاؤ میں تمہارے بتوں کی خبر لوں گا۔ اس کو کچھ لوگوں نے سن لیا۔

یہ لوگ تو میلہ میں عید منانے گئے اور اللہ کا خلیل چپکے سے طرلے کر بت خانہ گیا۔ بتوں کے سامنے عمدہ عمدہ کھانے دیکھ کر فرمایا۔ تم لوگ ان پرشادوں کو کھاتے کیوں نہیں۔ جب کچھ جواب نہ ملا تو فرمایا۔ ارے! تمھیں کیا ہوگیا

ہے بولتے کیوں نہیں۔ جب ان بے جان مورتیوں کے منہ سے کوئی جواب نہیں نکلا تو جلال آگیا۔ اور داہنے ہاتھ میں طبرلے کر ان سبھوں کو مار مار کر چور کر دیا۔ صرف بڑے بت کو باقی رکھا اور طبر اس کی گردن پر رکھ دیا۔

جب قوم کو اپنے معبودوں کی تباہی کا علم ہوا تو دوڑے ہوئے آئے اور پوچھنے لگے کہ کس نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ ظلم کیا۔ جن لوگوں نے حضرت ابراہیم کی دھمکی سنی تھی بتایا کہ ابراہیم سے ان کی برائی کرتے سنا ہے۔ غالباً یہ اسی کی حرکت ہے۔ قوم نے کہا اس کو پکڑ کر سب کے سامنے لاؤ۔ جب لائے گئے قوم نے آپ سے پوچھا کیا تم نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے آپ نے جواب دیا یہ حرکت ان کے بڑے کی ہے اگر بول سکے تو اس سے پوچھ لو اب قوم کی بولتی بند ہوگئی اور دل میں کہنے لگے سچی بات وہی ہے جو ابراہیم کہتے ہیں ہمیں لوگ ظالم ہیں لیکن برسہا برس کی گھٹی میں پلائی ہوئی بتوں کی عظمت نہ جا سکی دھاندلی سے بولے۔ کہ آپ تو جانتے ہیں کہ یہ بولتے نہیں۔ خلیل اللہ نے فوراً جواب دیا پھر تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ اللہ کو چھوڑ کر ان ناتوانوں کو پوجتے ہو جو تمہیں نہ نفع پہنچا سکیں نہ نقصان، تم پر اور تمہارے جھوٹے معبودوں پر تف ہو۔ تم لوگ کتنے بے سمجھ ہو، جب قوم ہر طرح سے عاجز ہوگئی تو (غالباً اسی وقت یا آگ میں ڈالنے کے بعد نمرود سے شکایت کی نمرود نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو طلب کر کے پوچھا کہ تمھارا رب کون ہے آپ نے جواب دیا جو مارتا ہے اور جلاتا ہے۔ نمرود بولا میں بھی مارتا اور جلاتا ہوں۔ اس نے قید خانہ سے دو ملزموں کو بلایا اور ایک کو قتل کرادیا۔ دوسرے کو چھوڑ دیا اور حضرت ابراہیم سے بولا دیکھو میں بھی مارتا جلاتا ہوں۔ حضرت ابراہیم نے اس کی بے وقوفی دیکھ کر اس سے واضح حجت پیش فرمائی اور فرمایا میرا رب وہ ہے جو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے اگر تو خدا ہے تو ذرا مغرب سے نکال دے۔ اب نمرود کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور

مبہوت ہو کر رہ گیا۔

آتش کدۂ نمرود

فیض جلیل خلیل سے پوچھو
آگ میں باغ لگاتے یہ ہیں

اہل بابل میں حق قبول کرنے کی استعداد ہوتی تو ان مناظروں میں ساکت و عاجز ہو جانے اور اپنے دیوتاؤں کی بے چارگی، بربادی کو آنکھوں سے دیکھنے کے بعد یقیناً قبول کر لیتے، لیکن وہ بدنصیب اپنی ذاتی طاقت اور نمرود کی سلطنت کی آڑ لیتے ہوئے اپنی ان ناکامیوں اور بتوں کی بربادیوں کا بدلہ لینے کے لئے اس پر آمادہ ہوئے کہ حضرت ابراہیم کو آگ میں جلا کر ہمیشہ کے لئے اس نعرۂ حق کو خاموش کر دیا جائے۔

چنانچہ نمرود کے حکم سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو "کوثی" میں قید کر دیا گیا اور تیس گز لمبا بیس گز چوڑا سنگین دیواروں کا آتش کدہ تعمیر ہوا۔ آتش کدہ کو لکڑیوں سے بھر کر آگ لگا دی گئی ایک مہینہ تک بھڑکائی گئی۔ جب اس کے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے تو اللہ کے خلیل کو گوپھن سے اس میں ڈال دیا گیا۔

روح الامین نے سدرہ سے دیکھا کہ اللہ کے خلیل کے پائے استقامت میں لغزش اور دل میں ہراس کیا معنی زبان پر حرف التجا تک بھی نہیں آیا۔ ان سے نہ دیکھا گیا۔ حاضر خدمت ہوئے اور پوچھا کوئی ضرورت ہے۔ فرمایا ہاں ہے۔ لیکن تم سے نہیں، جبریل نے عرض کیا تو جس سے ہے اسی سے عرض کیجئے فرمایا۔ علمہ بحالی کفانی عن سوالی۔ وہ حال جانتا ہے۔ دعا کی حاجت نہیں۔ اپنا پیغام پہنچانے کے جرم میں آگ میں جانے والے کو دیکھ کر اس قادر قیوم نے حکم فرمایا۔ یٰنَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰۤی اِبْرٰهِیْمَ اے آگ!

خبردار ابراہیم کا بال بیکا نہ ہو، ٹھنڈی ہو جا۔ اور ان کے لئے سلامتی کا سامان بن جا۔

قدرت خداوندی کا کتنا حیرت انگیز نظارہ ہے کہ وہی شعلے جس کے پاس کوئی پھٹک نہیں سکتا تھا۔ پرندے پر نہیں مار سکتے تھے۔ دفعتاً سرد ہو گئے بندشیں جل گئیں، لیکن حضرت ابراہیم پر آنچ بھی نہیں آئی۔

اہل بابل پر حجت الٰہیہ تمام ہو چکی تھی۔ قوم نے حق قبول کرنے کے بجائے آواز حق بلند کرنیوالے کو نیست و نابود کرنے کی امکانی کوشش ختم کر لی تو اب وقت آگیا کہ صفحہ ارض کو ان کے وجود سے پاک کیا جائے۔ لہٰذا حضرت ابراہیم کو ہجرت کا حکم ہوا، آپ اپنے چچازاد بھائی لوط بن ہاران کو لے کر شام چلے آئے۔ حضرت ابراہیم فلسطین میں اور لوط موتفکہ میں آباد ہوئے۔

نمرود اور قوم نمرود کی بربادی

اللہ عزوجل نے نمرود اور اہل بابل پر عذاب نازل فرمایا، مچھروں کی ایک فوج آئی۔ پوری قوم کے خون کے ساتھ گوشت بھی چٹ کر گئی، ایک مچھر نمرود کے دماغ میں گھس گیا۔ اس کے مغز کو چاٹ کر ہلاک کر دیا۔ اور اللہ کے خلیل کو آگ میں ڈالنے والی قوم کا نام صفحہ ہستی سے اس طرح مٹا دیا کہ کوئی ان پر آنسو بہانے والا تک نہ رہا۔ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ

نہ ان پر آسمان رویا نہ ان پر زمین روئی

مصر کا سفر

بابل سے آنے کے بعد ایک مدت تک حضرت ابراہیم علیہ السلام شام میں رہے۔ اتفاقاً شام میں ایک بار قحط پڑا۔ غلہ لینے کے لئے مصر[۱] گئے ساتھ میں آپ کی اہلیہ حضرت سارہ بھی تھیں وہ آپ کے چچا کی لڑکی تھیں[۲] ان سے آپ نے نکاح کر لیا تھا ان دنوں مصر پر اول فراعنہ[۳] حکمران تھا۔ اس ظالم کی عادت تھی کہ شادی شدہ عورتوں کو جبراً لے لیا کرتا تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام مصر پہنچے تو کسی نے فرعون مصر کو اطلاع دی کہ ایک صاحب مصر میں آئے ہیں۔ ان کے ہمراہ ایک حسین ترین عورت ہے فرعون مصر نے بلوا کر پوچھا تمہارے ساتھ کون عورت ہے؟ آپ نے فرمایا۔ وہ میری بہن ہے۔ آپ نے واپس آ کر حضرت سارہ سے بیان فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ میں نے اس تاویل سے کہ اس سرزمین پر سوائے ہم دونوں کے اور کوئی مسلمان نہیں تمھیں بہن بتایا تم سے اگر پوچھے تو اس کے خلاف مت کہنا۔

اس پر بھوت سوار تھا، اس کے باوجود کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے

---

[۱] عینی جلد ۶ ص ۷، [۲] لمعات [۳] اس کے نام کے بارے میں اختلاف کثیر ہے۔ کسی نے سنان بن علوان، کسی نے عمرو بن امراء القیس، کسی نے سفیان بن علوان بن قتیبہ صادوف لکھا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ یہ واقعہ اردن میں پیش آیا۔

عینی جلد ۶ ص ۱۷۔

حضرت سارہ کو بہن بتایا تھا، اس نے حضرت سارہ کو بلایا حضرت سارہ ادھر گئیں۔ حضرت ابراہیم نے ناموس کو معرضِ خطر میں دیکھ کر وضو کیا اور نماز شروع کر دی۔

حضرت سارہ کو دیکھ کر اس خبیث نے دست درازی کرنی چاہی، قدرت ایزدی سے اس کا گلا گھٹ گیا اور زمین پر گر کر ایڑیاں رگڑنے لگا۔ جب جان جاتی دیکھی تو اس نے حضرت سارہ سے کہا کہ دعا کرو میں ٹھیک ہو جاؤں اب تم سے کوئی تعرض نہیں کروں گا۔ حضرت سارہ نے یہ دعا کی [1]

اللھم ان کنت تعلم انی اٰمنت	اے معبود اگر تو یہ جانتا ہے کہ میں تجھ پر اور تیرے
بك وبرسولك واحصنت فرجی	رسول پر ایمان لائی ہوں اور میں نے اپنے ناموس
الا علٰی زوجی فلا تسلط علیّ الکافر	کو محفوظ رکھا ہے۔ تو اس کافر کو مجھ پر قابو مت
اللّٰھم ان یمت فیقال ھی قتلتہ،	دے اے معبود اگر یہ مر گیا تو لوگ کہیں گے اسی نے قتل کیا ہے

دعا کرتے ہی وہ ٹھیک ہو گیا۔ ٹھیک ہونے کے بعد پھر نیت بگڑی اور ہاتھ بڑھایا۔ پھر وہی گت ہوئی۔ پھر حضرت سارہ کی دعا سے ٹھیک ہو گیا۔ پھر نہیں مانا۔ تیسری بار ہاتھ بڑھایا تو پہلے سے سخت درگت ہوئی۔ پھر دعا کی التجا کی۔ دعا کے بعد ٹھیک ہو گیا۔

بار بار کے تجربے سے سمجھ چکا تھا کہ اس عفیفہ کی پشت پر کوئی غیبی قوت ہے اب ہمت نہ ہوئی۔ دربان سے بلا کر کہا۔ کہ تم بجائے انسان کے شیطان کو لائے ہو، اسے میرے ملک سے نکال دو [2] اور اس کی خدمت کے لئے ہاجرہ کو دے دو [3] حضرت سارہ، ہاجرہ کو لے کر حضرت ابراہیم کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ دیکھا کہ آپ نماز پڑھ رہے ہیں۔ حضرت ابراہیم نے ہاتھ کے اشارہ سے پوچھا کہ کیا حال ہے۔ عرض کیا۔ اللہ نے بدکار کا مکر اسی کے منہ پر دے

---

[1] بخاری کتاب البیوع۔ [2] عینی جلد ۷ ص ۳۵۴ [3] بخاری کتاب البیوع۔

مارا۔ اس نے ایک باندی خدمت کے لئے دی ہے۔

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام

فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلٰمٍ حَلِيمٍ

پس ہم نے اسے ایک بردبار بچے کی بشارت دی۔

اس واقعہ کے بعد حضرت ابراہیم پھر شام واپس آئے۔ حضرت سارہ نے حضرت ہاجرہ حضرت ابراہیم کو ہبہ کردیا۔

حضرت ہاجرہ اصل میں کسی قبطی بادشاہ کی بیٹی تھیں۔ جسے فرعونِ مصر نے قید کرکے باندی بنالیا تھا لیکن قسمت میں دین و دنیا کی ملکہ ہونا لکھا تھا۔ اس لئے قدرت نے انھیں اپنے خلیل کی خدمت میں بھیجدیا۔ کچھ دنوں میں اللہ عزوجل نے حضرت ہاجرہ کی آغوش حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے پُر کی۔ حضرت اسمٰعیل اگرچہ شام میں پیدا ہوئے تھے لیکن قدرت نے انھیں کوئی اور ہی بستی بسانے کے لئے منتخب فرمایا تھا۔

حضرت سارہ کو امید تھی کہ خدا انھیں کوئی اولاد دے گا جو نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے سرفراز ہوگی۔ حضرت اسمٰعیل کی پیشانی میں اس نور کی تابش دیکھ کر حضرت سارہ کو رشک ہوا۔ اور یہ رشک اس حد تک پہنچا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ ہاجرہ اور اس کے بیٹے کو میری نظروں سے اوجھل کیجئے اور اور کسی ایسی جگہ چھوڑ آیئے جہاں آب و دانہ نہ ہو۔ حضرت ابراہیم منجانب اللہ حضرت سارہ کی دل جوئی کے مامور تھے۔ اس لئے ان کی خواہش رد نہ کر سکے۔ ادھر وحی آئی کہ حضرت اسمٰعیل اور ان کی ماں کو اس سرزمین میں چھوڑ آیئے جسے میں نے قبلۂ توحید بنانے کے لئے روزِ ازل ہی سے چن لیا ہے۔

ماں بیٹے اور وادی غیر ذی زرع

رَبَّنَا إِنِّیْ أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِندَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ

اے ہمارے رب میں نے اپنی کچھ اولاد ناقابل کاشت میدان میں بسائی ہے ترے عزت والے گھر کے پاس تاکہ یہ لوگ نماز پڑھیں۔

حضرت سارہ کی خواہش کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام ماں اور دودھ پیتے بچے کو براق پر سوار کر کے لے چلے اور جہاں اب کعبہ ہے وہاں لائے زمزم کے پاس ایک اونچے درخت کے نیچے لے جا کر اتارا ایک توشے دان میں کھجوریں اور ایک مشک پانی رکھ کر پلٹے۔

اس وقت وہاں ببول وغیرہ کا جنگل تھا نہ آبادی تھی نہ پانی کے لئے کنواں یا چشمہ وغیرہ تھا۔ اس سنسان میدان میں اکیلے چھوڑ کر اپنے سرتاج کو واپس ہوتے ہوئے دیکھ کر حضرت ہاجرہ بیتاب ہوگئیں۔ پوچھا۔ اس چٹیل میدان میں کس کے سہارے چھوڑے جاتے ہیں۔ حضرت ابراہیم نے جواب نہ دیا اور نہ مڑکر دیکھا۔ حضرت ہاجرہ نے بار بار پوچھا جب کچھ جواب نہ ملا تو عرض کیا۔ کیا آپ کو خدا نے اس کا حکم دیا ہے، فرمایا۔ ہاں، اب اطمینان ہوا۔ بولیں ایسا ہے تو وہ ہمیں ضائع نہیں کرے گا۔ ہماری حفاظت کرے گا۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام چلتے چلتے پہاڑ کی گھاٹی کے قریب پہنچے تو اکلوتے بیٹے کی بے کسی پر شفقتِ پدری جوش میں آئی کعبہ کے نشانات کی طرف منہ کر کے یہ رقت انگیز دعا کی۔

رَبَّنَا إِنِّيْ أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي	اے ہمارے رب میں نے اپنی کچھ اولاد ایک
بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِندَ بَيْتِكَ	ناقابل کاشت میدان میں ترے عزت
الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ	والے گھر کے پاس چھوڑا، اے ہمارے

فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْ اِلَیْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ یَشْكُرُوْنَ (ابراہیم پ۱۳)

رب اس لئے کہ یہ نماز پڑھیں کچھ لوگوں کے قلوب ان کی طرف مائل کر دے اور انھیں پھلوں کا رزق دے۔ مجھے امید ہے کہ یہ لوگ تیرا احسان مانیں گے۔

بیر زمزم کا ابلنا

حضرت ہاجرہ وہ کھجوریں کھاتیں اور جب تک مشک میں پانی تھا پیتی رہیں۔ جب پانی ختم ہوگیا تو سخت پریشان ہوئیں یہاں تک کہ پیاس کی زیادتی سے وہ وقت بھی آن پہنچا کہ دودھ خشک ہوگیا اور بچے کی جان پر آبنی شدت کرب سے بچہ تڑپ تڑپ کر ایڑیاں رگڑنے لگا۔ ماتا کی ماری ماں سے یہ جانکاہ منظر دیکھا نہ گیا۔ بے تحاشا اٹھیں قریب ترین پہاڑ صفا تھا اس پر چڑھ کے درمیانی میدان پر نظر دوڑائی کہ شاید کوئی مددگار ہو لیکن وہاں کون تھا۔ نیچے اتریں جب نشیب میں پہنچیں تو کپڑے سمیٹ کر نالہ پار کر کے موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا لختِ جگر کے پاس جا کر ایک نظر ڈالی۔ پھر مروہ پر چڑھیں وہاں سے بھی نظر دوڑائی کہ شاید کوئی کہیں ہو۔ مایوس ہو کر پھر نیچے آئیں اور اسی طرح دوڑ کر وادی پار کی۔ اور بچے کے پاس جا کر ایک نظر ڈالی۔ اور پھر صفا پر گئیں۔ اسی طرح سات پھیرے لگائے۔ ساتویں بار جب بچے کے پاس آئیں تو دیکھا بچہ جاں بلب ہے۔ اب کی بار مروہ پر پہنچیں تو انھیں ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کہیں سے کوئی آواز آرہی ہے۔ چونک گئیں اور ہمہ تن متوجہ ہو کر آواز پر کان رکھا۔ اب آواز صاف سنائی دی۔ کوئی اسمٰعیل کے پاس کھڑا ہے۔ اور آواز دے رہا ہے۔ ڈھارس بندھی بولیں۔ اے غمگسار تیری آواز میں نے سنی۔ کیا تیرے پاس مجھ دکھیاری کی چارہ سازی کا کچھ سامان ہے۔ یہ جبریل امین تھے، اپنی ایڑی زمین پر ماری جس سے زمین پھٹ گئی اور چشمہ ابل پڑا

اس ڈر سے کہ کہیں پانی بہ کر ضائع نہ ہو جائے ارد گرد سے دھول اٹھا کر کے حوض کی طرح بناتی جاتیں اور کہتی جاتیں۔ جم جم۔ (تھم تھم) اور کچھ پانی چلو سے مشک میں بھر لیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ اسمٰعیل کی ماں پر رحم فرمائے۔ اگر وہ زمزم کو چھوڑ دیتیں تو وہ ایک بہتا ہوا چشمہ ہوتا۔ حضرت ہاجرہ نے پانی پیا بچہ کو پلایا جس سے ان دونوں کی بھوک و پیاس زائل ہو گئی۔

آب زمزم کی یہ خاصیت ہے کہ وہ کھانے پینے دونوں کے بجائے کام دیتا ہے۔

حضرت جبریل امین نے حضرت ہاجرہ کو تسلی دی کہ گھبراؤ نہیں پانی ختم نہ ہوگا۔ یہ بچہ اور اس کے باپ یہاں اللہ کے گھر کی تعمیر کریں گے۔ یہاں کے باشندوں کو اللہ ضائع نہیں کرے گا۔

بنی جُرہُم کی آمد

حضرت ابراہیم نے جس چٹیل میدان میں اپنے اہل کو چھوڑا تھا اس کے قریب ہی یمن کا ایک قبیلہ جُرہُم آباد تھا۔ ان کی ایک جماعت شام کو جاتے ہوئے اس میدان کے زیریں حصے میں اتری انھوں نے بطن وادی میں پرندوں کو چکر کاٹتے ہوئے دیکھ کر سمجھ لیا کہ وہاں پانی ہے۔ خبر لانے کے لئے کچھ آدمیوں کو بھیجا تصدیق کے بعد حضرت ہاجرہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اجازت کے بعد وہیں آباد ہو گئے۔ لیکن حضرت ہاجرہ نے چاہِ زمزم شریف کو اپنی ہی ملکیت میں رکھا۔

حضرت ابراہیم کا دستور تھا کہ ہر ماہ براق پر سوار ہو کر حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل کی دیکھ بھال کے لئے آیا کرتے، زمین ان کے لئے سمٹ دی جاتی تھی، صبح کو فلسطین سے چلتے اور مکہ آکر ان لوگوں سے مل کر واپس ہوتے۔ اور

قیلولہ کے وقت پھر فلسطین واپس پہنچ جاتے۔

شادی

قدرت نے بنی جرہم کو بھیج کر غیب سے حضرت ہاجرہ کی موانست کا مستقل سامان پیدا کر دیا۔ حضرت اسمٰعیل انھیں میں پلے بڑھے اور انھیں سے عربی زبان سیکھی، عربی زبان کی ایجاد کا سہرا اسی قبیلہ کے جداعلیٰ جرہم اور اس کے بھائی قطور کے سر ہے اس وقت اس قبیلہ کا سردار مضاض بن عمرو تھا، حضرت اسمٰعیل جب شادی کے قابل ہو گئے تو مضاض کی لڑکی سے شادی کر لی۔

جنگلی جانوروں کے شکار اور زمزم کے پانی پر گزران تھی۔ ایک روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مویشی چراتے تھے تیر و کمان بھی ساتھ رکھتے تھے کوئی شکار مل جاتا تو کر لیا کرتے تھے۔

حضرت اسمٰعیل نے اسی قبیلہ میں دو شادیاں کیں پہلی عورت کچھ ناشکری تھی۔ اپنے باپ کے حکم سے اسے طلاق دے کر دوسری شادی کر لی جو پہلے کے برخلاف سلیقہ مند شکرگزار تھی۔ اس کی سلیقہ مندی سے خوش ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے برقرار رکھنے کا حکم فرمایا۔

اس کی تفصیل بخاری وغیرہ میں یہ ہے کہ ایک بار حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم تشریف لائے اور اسمٰعیل کی اہلیہ سے پوچھا۔ اسمٰعیل کہاں ہیں؟ انھوں نے بتایا کہ شکار کرنے گئے ہیں۔ پھر دریافت فرمایا کہ تم لوگوں کی زندگی کیسے گزرتی ہے؟ اس نے کہا کہ ہم بری حالت میں ہیں تنگی اور شدت میں ہیں فرمایا جب تمھارے شوہر آجائیں تو ان سے سلام کہنا اور کہنا کہ اپنے دروازے کی چوکھٹ بدل دیں۔ جب حضرت اسمٰعیل واپس آئے تو انھیں ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی آیا تھا۔ پوچھا کیا کوئی آیا تھا؟ ان کی زوجہ نے بتایا کہ ہاں! ایک بزرگ ایسے ایسے آئے تھے۔ ہماری ان کی یہ یہ بات چیت ہوئی اور وہ آپ کو سلام کہہ

گئے ہیں اور کہہ گئے ہیں کہ اپنے دروازے کی چوکھٹ بدل دیں۔ حضرت اسمٰعیل نے بتایا کہ وہ میرے والد تھے اور انھوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تجھ کو الگ کردوں تم اپنے اہل میں چلی جاؤ اور اسے طلاق دے دیا۔

پھر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے بنی جرہم ہی میں دوسری شادی کی۔ کچھ دنوں کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام پھر تشریف لائے۔ اس وقت بھی حضرت اسمٰعیل موجود نہیں تھے ان کی بیوی سے ان کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا شکار کرنے گئے ہیں۔ دریافت فرمایا تم لوگ کیسے ہو؟ اور کیسے زندگی گزر رہی ہے اس نے عرض کیا ہم بہت اچھی طرح ہیں اور کشائش میں ہیں۔ اس نے حضرت ابراہیم سے عرض کیا سواری سے اتریئے کچھ کھا پی لیجئے۔ دریافت فرمایا تمہارا کیا کھانا پینا ہے، بتایا گوشت اور پانی۔ حضرت ابراہیم نے دعا کی۔ اے اللہ! انھیں گوشت میں برکت دے اور پانی میں۔ فرمایا جب تمھارے شوہر آجائیں تو ان کو سلام کہنا اور ان سے کہنا اپنے دروازے کی چوکھٹ باقی رکھیں۔

حضرت اسمٰعیل واپس آئے تو انھوں نے کچھ بو محسوس کی۔ پوچھا کوئی آیا تھا۔ اہلیہ نے عرض کیا کہ ہاں! ایک بزرگ بہت شاندار تشریف لائے تھے۔ آپ کے بارے میں انھوں نے پوچھا۔ پھر اس نے ساری گفتگو سنا دی۔ دریافت فرمایا کچھ حکم دے گئے ہیں؟ اس نے بتایا آپ کو سلام کہہ گئے ہیں اور حکم دیا ہے کہ اپنے دروازے کی چوکھٹ باقی رکھیں۔ فرمایا یہ میرے والد صاحب تھے اور انھوں نے حکم دیا ہے کہ تم کو اپنی زوجیت میں باقی رکھوں۔[1]

انقیاد وایثار کا عظیم امتحان

یٰاِبْرٰاھِیْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْیَا اِنَّا کَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ

---

[1] بخاری ج ۱، ص ۴۷۵ - ۴۷۶

اے ابراہیم تم نے اپنا خواب سچ کر دکھایا ہم نیکو کاروں کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں۔

حرم الٰہی کی تعمیر ہونے والی تھی۔ اس کی پاسبانی کے لئے ایک ایسے ایثار پسند انسان کی حاجت تھی جو اپنے فرض کی ادائیگی میں جان و مال سے دریغ نہ کرے۔ قدرت کو خوب معلوم تھا کہ کون ہے لیکن دنیا والوں کو بھی اس کا جذبۂ قربانی تسلیم کرانے کے لئے امتحان گاہ میں لانے کی ضرورت تھی۔

اس لئے جب حضرت اسمٰعیل پندرہ سال کے ہوئے تو حضرت ابراہیم کو خواب میں حکم ہوا کہ اپنے بڑھاپے کی اکلوتی اولاد جو تمھاری یادگار ہے میرے نام پر قربان کرو۔ اقلیمِ تسلیم و رضا کا شہنشاہ فرمانِ ایزدی اپنے نوجوان لختِ جگر کو سناتا ہے۔

یٰبُنَیَّ اِنِّیٓ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی

بیٹا میں نے خواب دیکھا ہے کہ تجھے ذبح کر رہا ہوں۔ بولو تم کیا کہتے ہو

پیکر ایثار و صبر عرض کرتا ہے۔

یٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ

اے باپ تعمیل حکم کیجئے انشاءاللہ آپ مجھے صابر پائیں گے۔

حضرت ابراہیم نے چھری لی۔ اور حضرت اسمٰعیل کو لے کر منیٰ میں آئے حضرت اسمٰعیل کو ماتھے کے بل لٹایا، قدرت کی بے نیازی کا اس سے بڑھ کر حیرت انگیز منظر دنیا نے کم دیکھا ہوگا۔ ایک طرف نوے سال کا بوڑھا باپ اپنے ہاتھ میں چھری لئے اس نورِ نظر کو ذبح کرنے کے لئے بڑھ رہا ہے جو تنہا وارثِ نبوت و حکمت تھا۔ دوسری طرف ماں باپ کے لاڈ و پیار کا خوگر نوجوان باپ کے قاتلانہ اقدام کو دیکھ کر بھی اطمینان سے سرِ نیاز جھکائے ہوئے ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیٹے کی گردن پر چھری رکھ کر پوری قوت سے چلایا، ارض و سما، دشت و جبل لرز اٹھے ملائکہ معصومین کانپ گئے لیکن باپ

بیٹے کے پائے استقلال میں ادنیٰ سی لرزش بھی نہ ہوئی۔

آخر امتحان لینے والے کو رحم آگیا۔ اس نے اس محیّر العقول ایثار کو قبول کرتے ہوئے پکارا۔

یَا اِبْرٰهِیْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْیَا	اے ابراہیم تم نے خواب کو سچ کر دکھایا۔
اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ۝	ہم نیکوکاروں کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں۔
اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِیْنُ ۝	یہ ایک عظیم الشان امتحان تھا۔

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بجائے جنت سے ایک جانور (بکری یا مینڈھا) آیا۔ اس کی قربانی ہوئی۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام قربان ہونے سے بچ گئے، لیکن ان کے ایثار و اخلاص کی یادگار میں ان کے پیروکاروں پر قیامت تک رسم قربانی واجب کر دی۔ وَتَرَكْنَا عَلَیْهِ فِی الْاٰخِرِیْنَ

برزمینے کہ نشانِ کفِ پائے تو بود
سالہا سجدہ صاحب نظراں خواہد بود

مرکز توحید کی تعمیر

اِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

یاد کرو جب ابراہیم و اسمٰعیل بیت اللہ کی کرسی بلند کر رہے تھے۔ اے ہمارے رب! ہماری جانب سے قبول کرنا۔ بیشک تو سنتا اور جانتا ہے۔

امتحان ہو چکا تو اب وقت آن پہنچا کہ امتحان میں کامیاب ہونے والے کو اس کا منصب عطا کیا جائے۔

حضرت ہاجرہ کے انتقال کے بعد حسب دستور ایک بار حضرت ابراہیم حضرت اسمٰعیل کو دیکھنے کے لئے تشریف لائے تو دیکھا کہ حضرت اسمٰعیل زمزم کے قریب ایک بڑے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تیر درست کر رہے ہیں۔ حضر

اسمٰعیل نے پدر بزرگوار کو دیکھا تو بڑھے اور مصافحہ و معانقہ و دست بوسی کی[1]

کعبہ کی تعمیر سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نے کی تھی۔ طوفانِ نوح میں وہ عمارت اٹھالی گئی، سرخ ٹیلے کی شکل میں اس کے نشانات باقی رہ گئے تھے، اس ٹیلے کی جانب اشارہ کرکے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے فرمایا کہ اللہ عزوجل نے اس جگہ اپنا گھر بنانے کا حکم دیا ہے کیا تم میری مدد کروگے؟

سعادت مند بیٹے نے جواب دیا۔ بسر وچشم، باپ بیٹے نے مل کر اول خانۂ الٰہی کعبہ کی بنیاد ڈالی، حضرت اسمٰعیل پتھر لالا کر دیتے تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام دیوار چنتے تھے، جب دیواریں بلند ہوگئیں تو ایک اونچے پتھر پر کھڑے ہوکر کام کرنے لگے۔ یہ پتھر آج تک بطور یادگار کے مقام ابراہیم کے نام سے وہاں رکھا ہوا ہے۔ جس پر مٹتے مٹاتے آج بھی نشانِ قدم موجود ہیں۔

جب عمارت تیار ہوگئی تو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے فرمایا ایک اچھا پتھر تلاش کرکے لاؤ۔ یہاں لگادوں جس سے لوگ طواف کا شمار کرسکیں حضرت اسمٰعیل نے ماندگی کا عذر کیا، مگر قبول نہ ہوا، مجبوراً جانا پڑا، پتھر تلاش کرکے لائے تو دیکھا کہ وہاں حجراسود نصب ہے۔ پوچھا کہ یہ کہاں سے آیا ہے، فرمایا وہ دے گیا ہے جو تیرے سہارے نہیں۔

حجراسود کے بارے میں ایک روایت یہ ہے کہ حضرت آدم کے ساتھ جنت سے آیا تھا پہلے وہ سفید و شفاف تھا، بوسہ دینے والوں کے گناہوں کو جذب کرتے کرتے سیاہ ہوگیا۔

جب باپ بیٹے یہ چوکور خانۂ توحید تیار کرچکے تو رقتِ قلب کے ساتھ یہ دعائیں کیں۔

---

[1] عینی، جلد ۷۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ٥ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ٥ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ٥

(سورہ بقرہ آیت)

اے رب ہماری طرف سے قبول فرما، تو سنتا اور جانتا ہے۔ اے رب ہم دونوں کو فرماں بردار رکھ اور ہماری اولاد میں سے ایک گروہ کو فرمانبردار بنا اور ہمیں عبادت کے قاعدے بتا اور ہماری توبہ قبول فرما۔ بیشک تو توبہ قبول فرمانے والا مہربان ہے۔ اور ان میں انھیں میں سے ایک رسول بھیج جو ان پر تیری آیتوں کو تلاوت کرے اور انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے۔ اور معصیت سے پاک کرے تو غالب حکمت والا ہے۔

یہ عمارت بغیر چھت کی تھی، ایک دروازہ تھا لیکن اس میں کواڑ چوکھٹ بازو وغیرہ نہ تھے۔ دروازہ کے پاس ایک گڈھا تھا جس میں نذرانے کی رقم جمع ہوتی۔

اس عمارت کا طول و عرض یہ تھا۔

بلندی ۹ گز، طول رکن شامی سے حجر اسود تک ۳۲ گز۔

عرض رکن شامی سے غربی تک ۲۲ گز۔

وفات

توراۃ میں ہے کہ حضرت سمٰعیل کی عمر ۱۳۷ سال کی ہوئی [1] یہ عرب، حجاز، یمن، حضرموت، کے نبی تھے۔ ان کو بارہ فرزند عطا ہوئے جن کے نام آگے آتے ہیں۔ ایک صاحبزادی کا پتہ چلتا ہے۔ جو عیسو بن اسحاق سے بیاہی گئیں۔

پہلے ان کی والدہ کا وصال ہوا۔ اور آج جہاں مطاف ہے۔ وہاں مدفون ہوئیں۔ بعد میں حضرت سمٰعیل کا وصال ہوا یہ بھی ماں کے پہلو میں مدفون ہوئے

---

[1] پیدائش ۔ ۲۵ ۔ ۱

ایک قول کی بنا پر ان کی قبریں حطیم میں ہیں۔

اہل کتاب کی ہفوات کا رد

اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے یہ اہل عرب کی روایات سے ماخوذ ہے۔ کلمات الٰہیہ میں تحریف کے پرانے عادی اہل کتاب نے جوش تعصب میں سرے سے ان تمام حقائق کا انکار کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ نہ تو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام عرب میں آباد ہوئے اور نہ اہلِ عرب حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ اور نہ حضرت اسمٰعیل ذبیح ہوئے۔ اور نہ مقام ذبح مکہ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ حضرت اسمٰعیل فلسطین کے جنوبی صحرا میں آباد ہوئے اور ذبیح حضرت اسحاق ہیں اور مقام ذبح شام ہے۔

اس انکار سے ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ بانیٔ اسلام جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نسلِ ابراہیمی سے اور ملّتِ اسلام کا ملّتِ ابراہیمی ہونا ثابت نہ ہو سکے۔

ہم ان تمام مختلف فیہ مسائل پر الگ الگ بحث کرنے سے پہلے ناظرین کی توجہ فن تاریخ کی اصل کلی کی جانب مائل کرنا چاہتے ہیں جس کی صحت میں کسی ماہر تاریخ کو انکار نہیں ہو سکتا، اور جو تاریخ کی بنیاد ہے۔

۱ ــــــ تاریخ کی تدوین سے قبل جو قومیں گزر چکی ہیں ان کے حالات معلوم کرنے کے لئے صرف دو ہی ذریعے ہیں۔ ایک تو زبانی روایات، دوسرے علم آثار۔

اگر زبانی روایات متعارض ہوں تو ترجیح اسی روایت کو حاصل ہوگی جس کی تائید علم آثار سے ہوتی ہے۔

۲ ــــــ ہر اجنبی کے حسب و نسب اور آباء و اجداد کے وطن کے بارے میں اس کا قول بہ نسبت دوسروں کے مقبول ہوتا ہے۔ جب تک کہ

دوسرا اس کی تردید ناقابل انکار دلائل سے نہ کردے۔

یہاں امور متنازع فیہ چار ہیں۔

۱ ـــــ حضرت اسمٰعیل عرب میں آباد ہوئے کہ نہیں ؟

۲ ـــــ عرب ان کی اولاد ہیں کہ نہیں ؟

۳ ـــــ ذبیح یہ تھے کہ حضرت اسحاق ؟

۴ ـــــ مقام ذبح عرب تھا کہ شام ؟

ان میں دو پہلی باتیں اہل عرب کے حسب ونسب اور مورث اعلیٰ کے وطن سے متعلق ہیں اہل عرب بتاتے ہیں کہ ہم حضرت اسمٰعیل کی اولاد ہیں اور ان کا وطن مکہ تھا اس کی تردید میں بنی اسرائیل کے پاس سنے سنائے افسانوں کے سوا کچھ نہیں۔ لہذا اپنے حسب ونسب اور اپنے مورث اعلیٰ کے وطن کے بارے میں اہل عرب جو کچھ کہتے ہیں ماننا پڑے گا۔

اسی طرح چاروں امور میں بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل کی روایتیں متعارض ہیں۔ لہذا غیر جانبدارانہ صورت پر ترجیح انھیں روایات کو دی جائے گی جنکی تائید آثار سے ہوتی ہو۔

آگے چل کر ہم بتائیں گے کہ علم الآثار کی ساری تائیدات بنی اسمٰعیل ہی کو حاصل ہیں لہذا ایک منصف مجبور ہے کہ بنی اسرائیل کے مقابلے میں بنی اسمٰعیل کی روایات کو صحیح مانے۔

اب ہم تفصیل کے ساتھ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ تحریف کے بعد بھی اہل کتاب کے صحائف میں ضمنی طور پر ایسی باتیں موجود ہیں جن سے اہل عرب ہی کی تائید ہوتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ علم الآثار کی تائیدات بھی نقل کرتے جائینگے۔

پہلا مسئلہ

حضرت اسمٰعیل کہاں آباد ہوئے

توراۃ میں ہے کہ اسمٰعیل فاران کے بیابان میں رہا[1]۔
معجم البلدان میں تصریح ہے کہ عرب کے جغرافیہ دانوں کا اس پر اتفاق ہے کہ فاران عرب کے پہاڑ کا نام ہے۔ عیسائی کہتے ہیں کہ فاران عرب کے پہاڑ کا نام نہیں بلکہ فلسطین کے جنوب میں جو صحرا واقع ہے اس کا نام ہے۔
عیسائی اس صحرا کے باشندے نہیں اور عرب والے عرب کے باشندے ہیں۔ اہل وطن کی شہادت دشت وجبل کے نام کے بارے میں دوسروں کے مقابلے میں یقیناً قابل ترجیح ہوگی لہٰذا اس میں کسی عقلمند کو شک نہیں ہوسکتا کہ فاران عرب کے پہاڑ کا نام ہے۔ رہ گیا اس صحرا کا نام فاران ہے یا نہیں، اس کے بارے میں وہاں کے باشندوں کی کوئی شہادت نہیں۔ صرف غیروں کا دعویٰ ہے اور اس میں بہت کچھ بحث کی گنجائش ہے۔
توراۃ میں ہے کہ حضرت اسمٰعیل کے یہ بارہ بیٹے تھے، نبیت۔ قدار۔ اوبئیل مبسام۔ سمعار۔ دومہ۔ مشا۔ حدد۔ تیما۔ طور۔ نفیس۔ قدمہ[2]
توراۃ میں یہ بھی ہے کہ یہ سب اپنی اپنی قوم کے رئیس تھے۔ اور انہوں نے اپنی بستیوں اور قلعوں کے نام اپنے ناموں پر رکھے تھے۔ یہ نزولِ توراۃ کے زمانے کی بات ہے۔ امتداد زمانہ سے کتنی بستیاں ناپید ہوگئیں۔ کتنے نام

---

[1] سفر پیدائش باب ۲۱۔ [2] پیدائش۔ ۲۵۔ ۱۳۔

ردو بدل ہو گئے۔ لیکن تلاش و تتبع کے بعد عرب کی متعدد بستیاں ان ناموں کے ساتھ بہت کچھ مناسبت رکھتی ہیں۔

"نبیت"۔ ینبوع، کے متصل ایک بستی کا نام ہے۔

"الخضیر"۔ نبیت کے تھوڑے ہی فاصلہ پر ایک شہر کا نام ہے، ظن غالب ہے کہ یہ نام "قدار" کی تصغیر "القدیر" کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔

"مبسام" کے آثار "نجد" میں ہیں۔

"دومہ" شام اور مدینہ کے مابین ایک مشہور بستی ہے۔ عہد رسالت میں یہاں عیسائیوں کی ریاست تھی اور "دومۃ الجندل" کے نام سے مشہور تھی۔

"مسا" یمن میں اس نام کے مناسب "موسی" نام کی بستی موجود ہے۔

"حدر" جنوبی عرب میں "حدیدہ نام کا شہر موجود ہے، بنو حدد ایک قبیلہ کا نام بھی ہے۔

"تیما" فدک کے قریب خیبر کے راستہ میں "تیما" نام کی بستی اب تک موجود ہے۔

"قدمہ" مسعودی نے قوم قدمان کو بنی اسمٰعیل میں بتایا ہے یہ لوگ "یمن" میں رہتے ہیں۔

دوسرا مسئلہ ــــــ قربانی کس کی ہوئی ؟-

یہ مسئلہ بھی اہل کتاب اور اہل اسلام میں بڑا ہی معرکۃ الآرا رہے کہ قربانی کا حکم حضرت اسحاق کے لئے ہوا تھا یا حضرت اسمٰعیل کے لئے۔ اہل کتاب اس بات پر متفق ہیں کہ قربانی کا حکم حضرت اسحاق کے لئے ہوا تھا۔ اور جمہور اہل اسلام اس کے قائل ہیں کہ یہ حکم حضرت اسمٰعیل کے لئے ہوا تھا۔ البتہ بعض مفسرین قلتِ تتبع کی بنا پر اس کے قائل ہیں کہ قربانی کا حکم حضرت اسحاق کے لئے تھا اس لئے ہم اس بحث کے دو حصے کرتے ہیں۔ ایک حصہ میں روئے سخن

اہل کتاب سے ہوگا۔ دوسری میں اہل اسلام سے۔

بحث اول

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ یہود کی خرد برد کی بنا پر توراۃ کے مُصَرّحات سے یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ قربانی کا حکم حضرت اسمٰعیل کے لئے تھا لیکن توراۃ کا دقّتِ نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ امر واضح ہو جائے گا کہ یہ حکم حضرت اسمٰعیل ہی کے لئے تھا نہ کہ حضرت اسحاق کے لئے۔

۱ ــــــ توراۃ میں ایک جگہ مذکور ہے کہ قربانی اسی انسان یا جانور کی ہوتی تھی جو پہلونٹا ہوتا۔ الفاظ یہ ہیں۔

لان لی کل بکر فی بنی اسرائیل من الناس والبہائم۔ (عدد ۸۔۱۷)

اس لئے کہ میرے لئے بنی اسرائیل میں ہر پہلا بچہ ہے انسانوں کا اور چوپاؤں کا۔

یہ حکم بنی اسرائیل کے ساتھ خاص نہ تھا بلکہ تمام شرائع سابقہ میں یہی حکم تھا اسی بنا پر ہابیل نے جس مینڈھے کی قربانی کی تھی وہ بھی پہلونٹا تھا۔

۲ ــــــ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جس بیٹے کی قربانی کا حکم ہوا تھا اس کے بارے میں تصریح تھی کہ وہ اکلوتا ہو اور محبوب ہو۔

(توراۃ تکوین۔ اصحاح ۲۲۔ آیت ۱۲)

۳ ــــــ توریت کے احکام کی رو سے جو بیٹا پہلونٹا ہوتا وہ بہر حال افضل ہوتا خواہ وہ اس بیوی سے ہو جو کمتر درجہ کی ہو۔

فانہ اول قدرتہ ولہ حق البکوریۃ (سفر تثنیہ اصحاح ۱۲۔ آیت ۱۵۔۱۷)

اس لئے کہ وہ اس کی پہلی قدرت ہے اور اس کو حق تقدم حاصل ہے۔

۴ ــــــ انسان کی فطرت کا بھی یہی تقاضا ہے کہ پہلونٹے بیٹے خصوصاً اکلوتے سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔ خصوصاً وہ اولاد جو برسہا برس کی مایوسی کے بعد ہزاروں دعاؤں، التجاؤں کے بعد پیدا ہو۔

۵ ــــــ اسی پر بس نہیں توراۃ میں اس کی تصریح ہے کہ حضرت

ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے جس بیٹے کی قربانی کی تھی وہ اکلوتا تھا۔ توراۃ میں قربانی کے تذکرے میں ہے کہ حضرت ابراہیم نے بیٹے کی قربانی کرنی چاہی تو فرشتے نے ندا دی ہاتھ روک لو۔

اس کے الفاظ یہ تھے۔

خدا کہتا ہے کہ چونکہ تونے ایسا کام کیا اور اپنے اکلوتے بیٹے کو بچا نہیں رکھا۔ میں تجھ کو برکت دوں گا اور تیری نسل کو آسمان کے ستاروں اور ساحل بحر کی ریتی کی طرح پھیلا دوں گا۔

(توراۃ تکوین اصحاح ۲۲۔ آیت ۱۵)

توراۃ کے ان اقتباسات سے واضح ہوگیا کہ قربانی اسی اولاد کی ہوئی جس میں یہ تین خصوصیات ہوں۔ پہلونٹا ہو، اکلوتا ہو، محبوب ہو۔ آؤ خود توراۃ کی روشنی میں تلاش کرو۔ یہ اوصاف مجموعی طور پر حضرت اسمٰعیل میں ہیں یا حضرت اسحاق میں۔ توراۃ میں بالتصریح یہ مذکور ہے کہ ہزاروں دعاؤں، تمناؤں کے بعد پہلے حضرت اسمٰعیل پیدا ہوئے اس لئے یہی پہلونٹے بھی ہوئے، اکلوتے بھی ہوئے، افضل ترین بھی ہوئے، محبوب بھی ہوئے۔ برخلاف حضرت اسحاق کے کہ یہ بعد میں پیدا ہوئے۔ اس لئے نہ یہ پہلونٹے ہوئے۔ نہ اکلوتے ہوئے، نہ افضل ہوئے نہ بہ نسبت حضرت اسمٰعیل کے محبوب۔ اس لئے توراۃ پر ایمان رکھنے کے دعویداروں کو یہ تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ ذبیح حضرت اسمٰعیل تھے نہ کہ حضرت اسحاق۔ اس سلسلے کے چند اقتباسات توراۃ کے اور ملاحظہ کریں۔

الف ——— حضرت ابراہیم کو جب خدا نے حضرت اسحاق کی خوشخبری دی تو حضرت ابراہیم نے اس وقت بھی حضرت اسمٰعیل کو یاد کیا۔

ب ——— حضرت اسحاق خدا کے وعدہ اور عہد کے مظہر ہیں[1]

ج ——— حضرت اسمٰعیل دعوت ابراہیم ہیں۔ یعنی حضرت

[1] تکوین ۱۸،۱۷

ابراہیم کی دعا اور خواہش سے پیدا ہوئے۔ اسی بنا پر خدا نے ان کا نام اسمٰعیل رکھا۔ کیونکہ عبرانی میں اسمٰعیل دو لفظوں سے بنا ہے۔ اسمع اور ایل۔ اسمع کے معنی "سننے" کے اور "ایل" کے معنی، خدا کے ہیں۔ یعنی خدا نے حضرت ابراہیم کی دعا سن لی۔ (تکوین اصحاح ۱۵۔۱۷۔۱۸)

د ـــــ خدا نے حضرت ابراہیم سے کہا کہ اسمٰعیل کے بارے میں میں نے تیری سن لی۔

حضرت اسحاق کی بشارت سن کر حضرت ابراہیم نے حضرت اسمٰعیل کو یاد کیا۔ یہ دلیل ہے کہ حضرت اسمٰعیل پہلے پیدا ہو چکے تھے، حضرت اسمٰعیل دعوت ابراہیم ہیں اسی لئے ان کا نام اسمٰعیل ہے۔ یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ یہ دعا سے پیدا ہوئے اس لئے اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ حضرت اسمٰعیل پہلوٹے بھی ہیں اکلوتے بھی ہیں تو یہی حسب احکام توراۃ افضل بھی ہیں اور محبوب ترین بھی۔ اس لئے لازم ہے کہ قربانی انھیں کی ہوئی۔

۶ ـــــ جو اولاد خدا کی نذر ہو جاتی اسے باپ کا متروکہ مال نہیں ملتا توراۃ میں مذکور ہے۔

فی ذالک الوقت افرز سبط اللاوی لیحملوا تابوت عهد الرب ولکی یقفوا امام الرب لیخدموہ ویبارکو باسمہ الی ھذا الیوم لاجل ذالک لم یکن للاوی قسم ولا نصیب مع اخوتہ الرب ھو نصیبہ۔ (توراۃ تکوین اصحاح ۱۔ آیت ۸۔۹)	تب خدا نے لاوی کی اولاد کو اس لئے مخصوص کر لیا کہ خدا کے عہد کا تابوت اٹھائے اور تاکہ خدا کے آگے کھڑا ہو۔ تاکہ وہ خدا کی خدمت کریں اور اس کے نام سے آج تک برکت لیں یہی وجہ ہے کہ لاویوں کو اپنے بھائیوں کے ساتھ حصہ اور ترکہ نہیں ملا۔ کیونکہ اس کا حصہ خدا ہے۔

اب توراۃ اٹھا کر دیکھو آپ کو صاف ملے گا کہ حضرت ابراہیم نے اپنا تمام اثاثہ حضرت اسحاق کو دیا۔ اور حضرت اسمٰعیل کو سوائے ایک پانی کی مشک اور

چند کھجوروں کے اور کچھ مال نہ ملا۔ لہذا ہر منصف کو یہ ماننا پڑے گا کہ قربانی حضرت اسمٰعیل ہی کی ہوئی نہ کہ حضرت اسحاق کی۔

۷ ـــــ جو خدا کی نذر ہوتا اس کے لئے "خدا کے سامنے" کا لفظ بولا جاتا۔ (توراۃ، سفر عدد ۶، ۳۰ـ تکوین ۱۷، ۱۴۸ تثنیہ تکوین ۱۸، تثنیہ ۱۰، ۸)

۸ ـــــ توراۃ میں ہر جگہ بسامنے زندہ رہنا۔ قربانی اور نذر ہی کے معنی میں بولا گیا ہے۔

۹ ـــــ توراۃ میں ہے کہ جب خدا نے حضرت ابراہیم کو حضرت اسحاق کی خوشخبری دی تو حضرت ابراہیم نے کہا۔

لیت اسمٰعیل یعیش اماملک   کاش اسمٰعیل تیرے سامنے زندہ رہتا۔

توراۃ میں قربانی کے لئے جو لفظ خاص ہے۔ وہ حضرت اسمٰعیل کے لئے وارد ہوا۔ اور حضرت اسحاق کے لئے نہیں آیا۔ یہ دلیل ہے کہ ذبیح یہ تھے نہ کہ حضرت اسحاق۔

۱۰ ـــــ ان شواہد کے علاوہ سب سے بڑی ناقابل انکار شہادت حضرت اسمٰعیل کے ذبیح ہونے کی یہ ہے کہ ان کی نسل ان کی ملت کے متبعین میں قربانی کی متعدد یادگاریں آج تک باقی ہیں۔ اور بنی اسرائیل کے پاس کوئی یادگار نہیں۔ اگر ذبیح حضرت اسحاق تھے تو ان کی نسل ان کی اتباع کے دعویداروں میں کوئی نشانی باقی رہتی۔ یہ کیا راز ہے کہ ان کے حریفوں کے یہاں متعدد یادگار۔ اور ان کے یہاں ایک بھی نہیں۔ وہ یادگار کیا ہے۔ سنیں۔

الف۔ "جو شخص خدا کی نذر کر دیا جاتا۔ وہ سر کے بال چھوڑ دیتا تھا اور معبد کے پاس جا کر اتارتا تھا۔ توراۃ میں ہے۔"

فھا انکِ تحملین وتلدین ابنا ولا	یعنی اب تو حاملہ ہوگی اور بچہ جنے گی اور
یعل موسیٰ راسلان الصبی یکون	اس کے سر پر استرا پھیرا نہ جائے گا کیونکہ
نذیرًا للہ۔ (توراۃ۔ قضاۃ اصحاح ۱۳۔۴)	یہ بچہ خدا کے لئے نذر کیا جائے گا۔

حج وعمرہ میں احرام باندھنے کے وقت سے لے کر تمام مناسک سے فارغ ہونے تک بال منڈوانا، کتروانا، اُکھاڑنا ممنوع ہے۔ مناسک سے فراغت کے بعد بال منڈوائے بال کتروانے کی اجازت ہے۔ ارشاد ہے۔

وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ — اپنے سروں کو نہ منڈاؤ جب تک قربانی کے جانور اپنی جگہ یعنی حرم میں نہ پہنچ جائیں (بقرہ آیت ۱۹۶)

ب ـــــ حضرت ابراہیم کو جب خدا نے بیٹے کی قربانی کا حکم دینا چاہا تو پکارا۔

اے ابراہیم۔ حضرت ابراہیم نے کہا۔ میں حاضر ہوں۔ (توراۃ تکوین اصحاح ۲۲ آیت)

حج یا عمرہ کا احرام باندھتے ہی ہر حاجی پکارتا رہتا ہے۔ لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ حاضر ہوں۔ حاضر ہوں یہ اسی سنت ابراہیمی کی اِتباع ہے۔

ج ـــــ شریعت ابراہیمی کے مطابق جسے خدا کی نذر کرتے وہ بار بار معبد، قربان گاہ کے گرد گھومتا۔

حج وعمرہ میں کعبہ کا طواف اور صفا ومروہ کی سعی اسی یادگار کی نشانی ہے۔

د ـــــ حضرت ابراہیم نے بچے کو ذبح کرنا چاہا تو انھیں روک کر اس کے عوض دنبہ ذبح ہوا۔

عیدالاضحیٰ میں ہر ذی استطاعت مسلمان اور حج میں حاجی جانوروں کی قربانی کرتا ہے۔ بلکہ یہ بہ شرائط واجب ہے، یہ سنت ابراہیمی کی پیروی ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے۔

سُنَّةُ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ — قربانی تمہارے باپ ابراہیم کی سنت ہے۔

ان یادگاروں کو دیکھ کر ہر ذی فہم یہ ماننے پر مجبور ہوگا کہ قربانی کا حکم حضرت اسمٰعیل کے لئے تھا جن کی نسل اور متبعین میں ان کی متعدد یادگاریں آج تک باقی ہیں۔ نہ کہ حضرت اسحاق کے لئے جن کی نسل اور پیروان ملت میں قربانی کی کوئی یادگار نہیں پائی جاتی۔

بحث دوم قرآن کریم کی روشنی میں حضرت اسمٰعیل کا ذبیح ہونا متعین ہے۔ یہاں کوئی صورت ہی نہیں کہ حضرت اسحاق کا ذبیح ہونا ثابت ہو سکے۔ قربانی کا واقعہ سورۂ "صٰفّٰت" میں یوں مذکور ہے۔

وَقَالَ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ. رَبِّ هَبْ لِیْ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ. فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِیْمٍ. فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْیَ قَالَ یٰبُنَیَّ اِنِّیْ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی قَالَ یٰاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ. فَلَمَّا اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ. وَنَادَیْنٰهُ اَنْ یّٰاِبْرٰهِیْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْیَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ. اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِیْنُ. وَفَدَیْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ. وَتَرَكْنَا عَلَیْهِ فِی الْاٰخِرِیْنَ. سَلٰمٌ عَلٰٓی اِبْرٰهِیْمَ. كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ. اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِیْنَ وَبَشَّرْنٰهُ

اور اس (ابراہیم) نے کہا۔ میں اپنے رب کی طرف جانے والا ہوں، اب وہ مجھے راہ دے گا۔ الٰہی مجھے لائق اولاد دے تو ہم نے اسے خوشخبری سنائی ایک بُردبار لڑکے کی پھر جب وہ اس کے ساتھ کام کے قابل ہو گیا کہا اے میرے بیٹے میں نے خواب میں تجھے ذبح کرتے ہوئے دیکھا اب تو دیکھ تیری کیا رائے ہے۔ اس نے کہا اے میرے باپ جس بات کا آپ کو حکم ہوا ہے کیجئے، خدا نے چاہا تو آپ مجھے صابر پائیں گے تو جب ان دونوں نے ہمارے حکم پر گردن رکھ دی اور باپ نے بیٹے کو ماتھے کے بل لٹایا (اس وقت کا حال نہ پوچھو) اور ہم نے اسے ندا فرمائی کہ اے ابراہیم بے شک تو نے خواب سچ کر دکھایا ہم ایسا ہی صلہ دیتے ہیں نیکوں کو بیشک یہ روشن جانچ تھی اور ہم نے ایک بڑا ذبیحہ اس کے فدیہ میں دے کر اسے بچا لیا۔ اور ہم نے پچھلوں میں اس کی تعریف باقی رکھی، سلام ہو ابراہیم پر۔ ہم ایسا ہی صلہ

بِاِسْحٰقَ نَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ
(آیت ۹۹ تا ۱۱۲)

دیتے ہیں نیکوں کو بے شک وہ ہمارے اعلیٰ درجے کے کامل الایمان بندوں میں ہے اور ہم نے اسے خوشخبری دی اسحٰق کی جو غیب کی خبریں بتانے والا نبی ہمارے قرب خاص کے سزاواروں میں ہوگا۔

ان آیات میں حضرت ابراہیم کے دو فرزندوں کا تذکرہ ہے، ایک وہ جو دعا سے پیدا ہوئے، اور ذبیح ہوئے۔ جن کا نام مذکور نہیں۔ دوسرے حضرت اسحاق جن کی ولادت کی بشارت ہے۔ اور یہ بالکل واضح ہے کہ اگر ذبیح حضرت اسحاق ہوتے تو جب "فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِیْمٍ" فرمایا جا چکا ہے تو اب بعد میں "فَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ" بالکل لغو ہو جاتا ہے۔ اس لئے ماننا پڑے گا کہ ذبیح حضرت اسحاق نہیں بلکہ حضرت اسمٰعیل ہیں۔

دوسرے یہ کہ اس آیت میں جو لڑکا ذبیح ہے اس کو "غُلٰمٍ حَلِیْمٍ" فرمایا گیا ہے۔ برخلاف اس کے حضرت اسحاق کی بشارت اس کے علاوہ دو جگہوں میں اور ہے ان کو وہاں "غُلٰمٍ عَلِیْمٍ" فرمایا گیا ہے۔ سورۂ "حجر" میں ہے۔

اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِیْمٍ — فرشتوں نے کہا ہم آپ کو علم والے بچے کی بشارت دیتے ہیں۔

سورۂ "ذٰریٰت" میں ہے۔

وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِیْمٍ — فرشتوں نے انہیں علم والے بچے کی بشارت دی۔

ہر جگہ حضرت اسحاق کی صفت "علیم" فرمانا اور ذبیح کا وصف "حلیم" فرمانا اس امر کی کھلی دلیل ہے کہ ذبیح حضرت اسحاق نہیں۔ حضرت اسمٰعیل ہیں ورنہ کیا وجہ ہے دیگر بشارتوں کے موقع پر ان کو "علیم" کہا جائے اور یہاں نیا وصف "حلیم" لایا جائے۔

تیسرے یہ کہ ان آیات سے معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم کے دونوں فرزند

دو مختلف طور سے پیدا ہوئے تھے۔ ایک دعا کے بعد دوسرے بغیر دعا کے اور قربانی اسی لڑکے کی ہوئی تھی جو دعا سے پیدا ہوئے تھے۔ توراۃ میں ہے۔

"اسمٰعیل دعوت ابراہیم ہیں" یعنی ابراہیم کی دعا اور خواہش سے پیدا ہوئے۔ اسی لئے ان کا نام "اسمٰعیل" پڑا۔ عبرانی زبان میں "سمع" کے معنی سننے کے ہیں۔ اور "ایل" کے معنی "خدا" کے ہیں اب لفظ اسمٰعیل کا ترجمہ ہوا خدا نے حضرت ابراہیم کی دعا سنی"۔ (تکوین۔ اصحاح ۱۷۔ ۱۸)

دوسری جگہ ہے کہ۔

"حضرت ابراہیم سے خدا نے کہا کہ اسمٰعیل کے بارے میں میں نے تیری سن لی"۔

ایک اور جگہ ہے۔

"حضرت اسحاق خدا کے وعدہ اور عہد کا مظہر ہیں"۔ (توراۃ تکوین ۱۷۔ ۱۸)

ان عبارت سے واضح ہے کہ حضرت ابراہیم کی دعا سے حضرت اسمٰعیل پیدا ہوئے تھے۔ لہٰذا ذبیح وہی ہوں گے نہ کہ حضرت اسحاق۔ جن کا وجود ایفاء عہد کی تکمیل تھا۔

چوتھے یہ کہ قربانی پر باپ بیٹے کی آمادگی کا نقشہ جن الفاظ میں کھینچا گیا ہے وہ یہ ہے۔

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ	تو جب ان دونوں نے ہمارے حکم پر گردن رکھی۔

اَسْلَمَا کا مصدر "اسلام" ہے جس کے معنی کسی کی بات ماننے کے ہیں۔ اس تسلیم و انقیاد کے بعد اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پیروان ملت کا نام مسلم رکھا۔ ارشاد ہے۔

مِلَّةَ اَبِیْكُمْ اِبْرٰهِیْمَ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ مِنْ قَبْلُ (سورۃ الحج آیت ۷۸)	تمہارے باپ ابراہیم کا مذہب اس نے پہلے تمہارا نام مسلمان رکھا۔

دستور یہی ہے کہ عظیم کارکردگی کے صلہ میں ملا ہوا اعزاز نسلاً بعد نسل چلتا رہتا ہے۔ لہٰذا یہ بات کھلی ہوئی ہے کہ قربانی کے اعزاز میں ملا ہوا خطاب جس کے وارثین کا ہو وہی ذبیح یقینی طور پر ہوں گے۔

وارثین حضرت اسحٰق نے اپنے آپ کو بنی اسرائیل، یہود، نصاریٰ، ابن اللہ اور احبار اللہ وغیرہ وغیرہ الفاظ سے مشہور کیا۔ لیکن ان میں سے کسی نے اپنے کو "مسلم" نہیں کہا۔ برخلاف وارثین حضرت اسمٰعیل کے کہ وہ صبح قربان سے لے کر الی یومنا ہذا اپنے آپ کو "مسلمان" کہنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ لہٰذا ثابت ہوگیا کہ مسلمانوں کے مورث اعلیٰ حضرت اسمٰعیل ہی ذبیح ہیں۔

"مواہب اللدنیہ" میں مذکور ہے کہ عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک یہودی عالم سے دریافت فرمایا کہ ذبیح کون تھا تو اس نے جواب دیا کہ امیر المومنین! یہودی یقیناً خوب جانتے ہیں کہ اسمٰعیل ذبیح ہیں اور از راہِ حسد اُن کے ذبیح ہونے سے انکار کرتے ہیں اور حضرت اسحاق کو ذبیح بتاتے ہیں۔

علامہ جلال الدین سیوطی نے تحریر فرمایا ہے کہ حضرت اسحاق کو ذبیح کہنا اہلِ کتاب کی تحریفات سے ہے۔

تیسرا مسئلہ ـــــ قربانی کہاں ہوئی؟

اس میں اختلاف ہے کہ قربانی کہاں ہوئی تھی۔ شام میں کہ عرب میں۔ لیکن یہ اختلاف ذبیح کے اختلاف کی فرع ہے۔ اہل کتاب حضرت اسحٰق کو ذبیح مانتے ہیں۔ لہٰذا وہ اس کا موقع شام مانتے ہیں۔ اور اہل اسلام چونکہ حضرت اسمٰعیل کو ذبیح مانتے ہیں لہٰذا اس کا موقع عرب بتاتے ہیں اور جب ہم نے دلائل قاہرہ سے ثابت کر دیا کہ ذبیح حضرت اسمٰعیل ہیں تو ماننا پڑے گا کہ مقام قربانی عرب ہی ہے اسکے علاوہ بحث اول میں گزرا کہ جس کی قربانی کی جاتی وہ اپنے بال چھوڑ دیتا جو قربان گاہ پر

اتارا جاتا، قربان ہونے والا قربان گاہ کے پھیرے کرتا، شام میں کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں کسی مذہب والے اس قسم کی رسم ادا کرتے ہوں۔

نیز حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اصل یادگار جانوروں کی قربانی ہے۔ قربان گاہ شام میں ہوتی تو اس یادگار کی تکمیل اسی قربان گاہ پر ہونی چاہئے تھی، نہ کہ عرب میں۔

علاوہ ازیں "توراۃ" میں قربان گاہ "مریا" بتائی گئی ہے۔ "مریا" کون سی جگہ ہے۔ اس کے تعین میں یہود و نصاریٰ خوب دست بگریبان ہیں یہودی کہتے ہیں۔ ۔ ۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں ہیکل سلیمانی تھا۔ عیسائی کہتے ہیں۔ نہیں یہ وہ جگہ ہے جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دی گئی۔

تیسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ دونوں غلط ہیں۔ یہ مقام "جریزیم" کے پہاڑ پر ہے۔ اختلافات آگے بڑھے تو کچھ لوگوں نے کہا کہ "مریا" قربان گاہ کا نام نہیں۔ بلکہ اس کا وصف ہے۔

مترجمین نے اس کے مختلف ترجمے کئے۔ لیکن ان میں کے محققین نے اس کا ترجمہ نہیں کیا ہے۔ پھر کچھ زمانے کے بعد یہ لفظ "مریا" سے "مورہ" ہو گیا۔ جس کی وجہ یہ ہوئی کہ دونوں لفظ کا املا "عبرانی زبان" میں قریب قریب ہے۔ "مورہ" کے بارے میں توراۃ میں تصریح ہے کہ عرب میں ہے۔

وکان جیش المد یاینین شمالھم	اور مدیانیوں کی فوج شمال کی جانب
عند تل "مورہ" فی الوادی۔	"مورہ" پہاڑ پر وادی میں تھی۔

"مدیان" عرب میں واقع ہے۔ اور عرب میں "مورہ" نام کی کوئی پہاڑی نہیں۔ البتہ "مروہ" نام کی ایک پہاڑی ہے۔ لہٰذا یہ بات بالکل قرین قیاس ہے کہ "مورہ" وہی پہاڑی ہے جو اب "مروہ" کے نام سے مشہور ہے۔ جس کے دامن میں "وادی غیر ذی زرع" ہے۔

"مؤطا امام مالک" میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے "مروہ" کی

کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ قربان گاہ یہ ہے اور مکہ کی تمام پہاڑیاں اور گھاٹیاں قربان گاہ ہیں۔

توراۃ میں "مریا" یا "مورہ" اور حدیث میں "مروۃ" کو قربان گاہ بتانا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ یہ ایک ہی لفظ کے مختلف تلفظ ہیں۔ علاوہ ازیں "یسعا" نبی کی کتاب میں ہے۔

"اونٹنیاں تجھے آکر چھپالیں گی "مدیان" اور "عیفا" کے اونٹ وہ سب جو "سبا" کے ہیں۔ آئیں گے وہ سونا اور لوبان لائینگے اور خداوند کو بشارت سنائیں گے، قیدار کی ساری بھیڑیں ترے پاس جمع ہوں گی۔ نبیت کے مینڈھے تیری خدمت میں حاضر ہوں گے۔ وہ میری منظوری کے واسطے مرے مذبح پر چڑھائے جائیں گے اور میں اپنے شوکت والے گھر کو بزرگی دوں گا۔"

(۶۰۔ باب، ۶، ۷ درس)

اس سے کوئی ذی انصاف انکار نہیں کرسکتا کہ "مدیان" "عیفا" "سبا" بنی قطورہ باشندگان یمن کے اونٹ "قیدار" کی بھیڑیں "نبیت" کے مینڈھے جس مذبح پر چڑھائے جاتے ہیں اور جو خدا کا مذبح ہے۔ جس سے خدا کے شوکت والے گھر (بیت الحرام) کو بزرگی حاصل ہوتی ہے۔ وہ مکہ میں ہی ہے شام میں کوئی مذبح نہیں جسے خدا کا مذبح کہا جائے۔ اور جہاں اہل یمن اور اہل عرب کی قربانیاں چڑھائی جاتی ہوں۔ اور جس سے خدا کے شوکت والے گھر کی بزرگی ظاہر ہوتی ہو۔

خلاصہ کلام یہ کہ مذبح اور مذبح کی تعیین میں بنی اسرائیل اور اہل عرب کی روایات متعارض ہیں۔ اصول تنقید کی رو سے ایک ناقد روایات کے تعارض کے وقت درایت سے کام لینے پر مجبور ہوتا ہے۔ درایۃً بنی اسرائیل کے پاس اپنی روایات کی تائید میں کوئی شہادت نہیں۔ برخلاف اہل عرب

کے کہ ان کی روایات کی تائید میں متعدد شہادتیں مل رہی ہیں۔ لہذا ایک منصف مجبور ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے مقابلے میں اہل عرب کی روایات کو صحیح مانے۔

مُصَنِّف کی دیگر اہم تصنیفات

نزہتہ القاری بخاری شریف کی مکمل اردو شرح، نو حصوں میں۔

مقالات شارح بخاری مصنف کے چند علمی مضامین کا گلدستہ۔ دو حصوں میں۔

اثبات ایصال ثواب فاتحہ کے مُرَوَّجہ طریقوں کے استحسان کا ثبوت۔

اسلام اور چاند کا سفر صحابۂ کرام اور تابعین عظام کے اقوال سے اس کا ثبوت کہ چاند پر پہنچنا ممکن ہے۔

فتنوں کی سرزمین کون؟ متعدد صحیح احادیث سے اس کا ثبوت کہ نجد فتنوں کی سرزمین ہے۔

تحقیقات دیوبندیوں کے بہت سے شبہات کے دندان شکن جوابات۔ دو حصوں میں

مسئلۂ تکفیر اور امام احمد دیوبندیوں کی تکفیر کے بنیادی وجوہ کا بیان

ملنے کا پتہ

دائرۃ البرکات، اشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ ۲۷۶۴۰۴

عدنان

سیدنا اسمٰعیل علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے بارہ بیٹوں میں قیدار نے حجاز میں بودوباش اختیار کی۔ اللہ عزوجل نے انھیں عزت وشہرت عطا کی۔ یہی حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے جد ہیں۔ قیدار کے بعد بنی جرہم کے تغلّب کی وجہ سے دیگر اجداد کو وہ شہرت نہ حاصل ہوسکی۔ آگے چل کر شجرہ پاک میں جو ہستی نمایاں ہوئی وہ عدنان کی تھی۔

عدنان بچپن ہی سے اعدا کی نظروں میں کھٹکتے تھے، پیشانی میں نور نبوت دیکھ کر دشمن انھیں قتل کر ڈالنا چاہتے تھے۔ مگر حفاظت الٰہی کے مقابلے میں دشمن ناکام رہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ عدنان۔ معد۔ ربیعہ۔ خزاعہ اور اسد ملت ابراہیم پر تھے۔ انھیں ہمیشہ خیر سے یاد کرنا۔ انھوں نے حدود حرم کے پتھر نصب کرائے۔ ایک قول پر انھیں نے سب سے پہلے کعبے پر چمڑے کا غلاف چڑھایا۔ بخت نصر نے جب عرب پر حملہ کیا یہ قتل ہوئے اور ان کے صاحبزادے معد باقیماندہ اشخاص کے ساتھ گرفتار ہوئے۔ ان کے دو فرزند تھے۔ معد اور عک۔ عک نے یمن میں بودوباش اختیار کی وہیں اپنی سلطنت قائم کی۔

مَعَد

ارمیا پیغمبر علیہ السلام اور ان کے کاتب برخیا انھیں بخت نصر کی قید سے چھڑا کر عرب لائے۔ غالبًا انھیں سے دریافت کرکے ان کے کاتب نے وہ شجرہ مرتب کیا تھا۔ جس کا ذکر طبری نے کیا ہے

کہ تدمر کے ایک یعقوب نامی نومسلم نے جو پہلے یہودی تھا، بتایا کہ عدنان کا ایک نسب نامہ میرے پاس ارمیا پیغمبر کے منشی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ جس میں عدنان سے حضرت اسمٰعیل تک چالیس اشخاص ہیں۔

یہ جب عرب واپس ہوئے تو انھوں نے بنی جرہم کی تلاش کی۔ بڑی مشکل سے جرہم بن جلیمہ کا پتہ چلا یہ ان سے ملے اور ان کی صاحبزادی سے شادی کی۔ انھیں سے نزار پیدا ہوئے۔ یہ بڑے جری بہادر جنگجو تھے انکی یہودیوں سے بارہا جنگیں ہوئیں جس میں یہ ہمیشہ غالب رہے۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ نزار اور قنص۔

نِزَار

ان کی کنیت ابوربیعہ ہے۔ ان کی والدہ کا نام معانہ یا ناعمہ تھا یہ جب پیدا ہوئے تو نور نبوت انکی پیشانی پر درخشاں تھا۔ جسے دیکھ کر ان کے والد بہت خوش ہوئے۔ خوشی میں اونٹ ذبح کر کے قوم کو کھلایا اور کہا کہ یہ سب اس بچے کے حق میں تھوڑا ہے۔ تھوڑے کی عربی نزار ہے۔ لہذا ان کا نام نزار پڑ گیا۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا سلسلہ نسب ان سے ملتا ہے۔ ان کے چار فرزند تھے، مضر، ایاد، ربیعہ، انمار۔ نزار نے اپنے ترکہ سے مضر کو اونٹ اور سرخ خیمہ اور ربیعہ کو اسپ وسلاح، اور انمار کو حمار دیئے تھے مضر اور ربیعہ کی نسل وسط عرب میں، انمار کی نجد اور اطراف حجاز میں، ایاد کی سرحدی علاقہ میں پائی جاتی ہے۔ نزار نے دو ۲ شادیاں کیں ایک سودہ بنت عک سے جن سے مضر اور ایاد ہیں، دوسری خدالہ بنت وجلان جرہمی سے جن سے ربیعہ اور انمار ہیں۔

مُضَر

ان کی والدہ کا نام سودہ یا خیبہ تھا۔ ان کا لقب مضر الحمراء تھا یہ سفید رنگ شیریں آواز تھے۔ حدی خوانی کے موجد یہی ہیں۔ ملت ابراہیم کے پابند تھے۔ انھیں کھٹا دودھ بہت پسند تھا۔ بنی عدنان میں سب سے زیادہ صاحب ثروت تھے۔ باپ نے انھیں سرخ چیزیں یعنی سرخ اونٹ، سرخ خیمہ، سرخ دینار دیا تھا۔ اس لئے مضر الحمراء کہلائے۔

اِلیَاس

ان کی والدہ کا نام ام الرباب تھا جو معد کی پوتی تھیں۔ یہ اپنے پشت میں نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی تلبیہ (لبیک لبیک) پڑھنے کی آواز سنتے تھے۔ ان کے کارہائے نمایاں یہ ہیں۔ حج کے موقع پر قربانی کے لئے اونٹوں کو بھیجنے کی سب سے پہلے رسم انھوں نے قائم کی۔ بنی اسمٰعیل نے خانہ کعبہ رد و بدل کر کے مقام ابراہیم کو اپنی جگہ سے ہٹا دیا تھا۔ رکن کو بیت اللہ سے نکال کر جبل ابو قبیس میں ڈال آئے تھے، انھوں نے وہاں سے لاکر بیت اللہ شریف میں نصب کیا۔ علامہ سہیلی نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ الیاس کو برا مت کہو وہ مومن تھے۔ انکے تین بیٹے تھے۔ مدرکہ، طابخہ، قیس غیلان۔ انھیں کی نسل سے، عرب کے یہ مشہور و معروف قبائل بنو اشجع، ذبیان، غطفان، ہوازن، بنو سلیم ہیں۔

مُدرِکَہ

اصل نام عامر یا عمرو تھا۔ چونکہ آباء و اجداد کے فضل و کمال حاصل کر لئے تھے، اس لئے مدرکہ نام پڑا۔ اصل لفظ مدرک ہے۔ تا معنی وصفی سے اسم کی جانب نقل کے لئے ہے۔ ... مدرکہ کے معنی عربی میں پانے والے کے ہیں۔ ارباب سیر نے مدرکہ نام رکھنے کی وجہ یہ بھی لکھی ہے کہ ایک بار اونٹ یا خرگوش کا تعاقب کر کے پکڑ لیا تھا۔ باپ نے شاباشی کے طور پر کہا مدرکہ اور وہ مشہور ہو گیا۔ ان کے دو بیٹے تھے خزیمہ اور ہذیل۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہذیل کی نسل سے ہیں۔

خُزَیمَہ

ان کی کنیت ابو الاسد تھی۔ تین بیٹے تھے۔ کنانہ، اسد، ہون۔ عضل اور قارہ، ہون ہی کی نسل سے ہیں۔

ام المومنین حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا بنو اسد سے ہیں۔

کِنَانَہ

کنانہ کی کنیت ابو النضر تھی، ماں کا نام غوریہ بنت سور بن قیس تھا۔ چھ بیٹے تھے۔ نضر، مالک، عبد

مناۃ، عمر، احابیش، عامر۔

نضرؔ قیس نام۔ ابو مخلد کنیت، نضر لقب تھا، نضر زر سرخ کو کہتے ہیں یہ نہایت حسین تھے، چہرے کی آب و تاب کی وجہ سے نضر مشہور ہو گئے ماں کا نام برہ بنت امر تھا۔ مدرکہ کے بھائی طابخہ کی پڑپوتی تھیں۔

اکثر علما کا قول ہے کہ قریش انھیں کا خطاب ہے۔ قریش کی وجہ تسمیہ میں اہل لغت نے عجیب عجیب موشگافیاں کی ہیں۔ کسی نے کہا کہ قریش ویل (مچھلی کو کہتے ہیں) جو سمندری جانوروں میں سب سے بڑی ہوتی ہے۔ چونکہ یہ قبیلہ تمام قبائل عرب سے زیادہ طاقتور تھا اور ذی شوکت تھا۔ اس لئے اس کا نام قریش پڑ گیا۔ چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے۔

وقریش الذی یسکن البحر	بھا سمیت قریش قریشا
وہ قریش (ویل) جو سمندر میں رہتی ہے	اسکے نام پر قریش کا قریش نام پڑ گیا
سلطت با لعلو فی لجۃ البحر	علی ساکن البحور جیوشا
سمندر کی گہرائی میں	ساکنان سمندر پر غالب آتی ہے
تاکل الغث والسمین لا تترك	فیھا الذی الجناحین ریشا
دبلا ہو یا فربہ سبھی کو کھا جاتی ہے	پر تک نہیں چھوڑتی
ھکذا فی الانام حی قریش	یا کلون البلاد اکلا کمیشا
یوں ہی مخلوق میں قبیلہ قریش ہے	مخلوق کو بہت جلد چٹ کر جاتے ہیں
وبہ اخر الزمان نبیؐ	یکثر القتل فھموا خموشا
انھیں میں نبی آخر الزماں ہوگا	جو انھیں کفر کی قرار واقعی سزا دے گا
یملأ الارض خیلہ ورجال	یحشرون المطی حشرا کثیشا
انکے سوار اور پیادے زمین کو بھر دیں گے	سواریوں کو ہر طرف سے جمع کر دیں گے

کسی نے کہا۔ قریش تقرّش سے بنا ہے۔ تقرّش کے معنی جمع ہونے کے ہیں۔ چونکہ یہ قبیلہ متفرق ہونے کے بعد اکٹھا ہوا ہے۔ لہٰذا اس کو قریش کہتے

ہیں کسی نے کہا۔ قریش کے معنی کمانے اور جمع کرنے کے ہیں۔ یہ قبیلہ تجارت پیشہ تھا، اس لئے ان کو قریش کہنے لگے۔ کسی نے کہا قریش تقریش سے بنا ہے۔ تقریش کے معنی تفتیش کے ہیں۔ چونکہ ایام حج میں فقرا کو تلاش کر کر کے ان کی مدد کیا کرتے تھے، اس لئے ان کو قریش کہتے ہیں۔

مَالِکٌ ان کی کنیت ابوالحارث تھی۔ ماں کا نام حارثہ بنت عدوان تھا۔ دو اولادیں تھیں۔ ایک فہر دوسرے حارث۔

فِهْرٌ امام زہری نے فرمایا۔ ان کی ماں نے ان کا نام قریش رکھا اور باپ نے فہر۔ ان کے وقت میں حسان حاکم یمن کی نیت خراب ہوئی اس نے چاہا کہ کعبہ ڈھا کر اس کی جگہ یمن میں دوسرا کعبہ تعمیر کرے۔ اس کے لئے وہ ایک فوج لے کر مکے پر چڑھ آیا۔ فہر نے اپنے بھائیوں کو لے کر اس کا مقابلہ کیا۔ حسان گرفتار ہوا۔ اسکی فوج شکست کھا گئی۔ بیس سال قید میں رہا۔ آزادی کے بعد واپس جاتے جاتے راستہ میں مر گیا۔ اس سے فہر کا رعب تمام عرب پر چھا گیا۔

علمائے سیر کی ایک جماعت اس کی قائل ہے۔ کہ قریش انہیں کا لقب ہے زین عراقی کہتے ہیں۔

اما قریش فالاصح فهر جماعها والاکثرون النضر

صحیح ترین قول یہی ہے کہ فہر ہی قریش ہیں۔ اور بہتوں کا قول ہے کہ قریش نضر کا لقب ہے۔ ان دونوں اقوال کا حاصل ایک ہے۔ کیونکہ نضر کی نسل صرف مالک سے چلی اور مالک کی صرف فہر سے اس لئے فہر کی اولاد کے علاوہ نضر کی اولاد کا وجود نہیں۔

غَالِبٌ ابوہیثم ان کی کنیت تھی۔ ماں کا نام لیلیٰ بنت حارث تھا۔ دو صاحبزادے تھے۔ ایک کا نام لُؤیّ دوسرے کا نام ہیثم تھا۔

لُؤَیّ ان کی ماں کا نام عاتکہ تھا یہ نضر بن کنانہ کی پوتی، مخلد کی بیٹی

تھیں۔ ان کے چار بیٹے تھے۔ (۱) کعب (۲) عوف (۳) عامر (۴) حارث۔

کَعْب بڑے دبدبہ والے اور ذیشان تھے۔ یہاں تک کہ واقعۂ فیل تک چار صدی کے لگ بھگ ان کا سنہ وفات جاری رہا۔ یہی وہ بزرگ ہیں: جنھوں نے جمعہ کے دن قوم کو اکٹھا کر کے خطبہ پڑھنے کا رواج قائم کیا۔ ان کا دستور تھا کہ ہر جمعہ کو جس کو یہ لوگ 'یوم عروبہ' کہتے تھے۔ قوم کو جمع کر کے خطبہ پڑھا کرتے تھے۔ اور قوم کو بتاتے تھے کہ میری اولاد میں ایک پیغمبر آخرالزماں تشریف لائیں گے۔ تم سب ان پر ایمان لانا اور ان کا اتباع کرنا یہ نور انھیں کا ہے۔

یا لیتنی کنت شاهداً فحوی دعوته — اذا قریش تنفی الحق خذلانا

اے کاش میں انکی دعوت کے وقت موجود رہتا — جب کہ قریش حق کو جلا وطن کریں گے

ان کی کنیت ابوالھُصیص تھی۔ ان کے پانچ بیٹے تھے۔ مُرّہ[1]، ہصیص[2]، سہم[3]، جمح[4]، عدی[5]۔

مُرَّہ ان کی کنیت ابو یقطعہ تھی۔ ماں کا نام نخیتہ یا وحشیہ تھا۔ یہ شیبان بن محارب بن فہر کی بیٹی تھیں۔ ان کے تین بیٹے تھے۔ (۱) کلاب (۲) تیم (۳) مخزوم۔

کِلَاب حکیم نام تھا۔ ابو زہرہ کنیت تھی ماں کا نام ہندہ بنت سریر تھا شکار کا شوق بہت تھا۔ اس کے لئے شکاری کتے پال رکھے تھے اس لئے کِلاب کے نام سے مشہور ہو گئے۔ کِلاب کلب کی جمع ہے۔ کلب کے معنی کتے کے ہیں۔

اہل عرب کی عادت تھی کہ اولاد کے نام ثعلبہ صخر وغیرہ رکھتے تھے۔۔۔ اور غلاموں کے نام رباح۔ ایمن وغیرہ اچھے رکھتے تھے۔

کسی نے پوچھا تو ایک عرب نے جواب دیا۔ عبید نا لنا وابنائنا لاعدائنا۔ غلاموں کے نام اپنے لئے رکھتے ہیں۔ اور اولاد کے نام دشمنو

کے لئے۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ قصی۔ زہرہ۔

قصیّ

نام زید تھا۔ قصی لقب تھا۔ اس لقب کے مشہور ہونے کی وجہ یہ ہوئی کہ عہدِ طفولیت میں ان کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا۔ ماں نے بنی عذرہ کے ایک شخص ربیعہ بن حرام سے شادی کرلی۔ یہ قبیلہ شام کی سرحد پر رہتا تھا۔ یہ بھی ماں کے ساتھ وہیں رہے۔ جوان ہونے کے بعد مکہ واپس آئے۔

قصیّ قاص کی تصغیر ہے۔ قاص کے معنی دور ہونے کے ہیں چونکہ یہ بچپن میں وطن سے دور رہے۔ لہٰذا ان کو قصی کہنے لگے۔ ان کی ماں کا نام فاطمہ بنت سود تھا۔ قصی جب مکہ واپس آئے تو ان کے بڑے بھائی زہرہ نابینا ہو چکے تھے قصی کی آواز باپ کی آواز سے مشابہ تھی۔ آواز سے شناخت کی اور جائداد سے ان کو حصہ دیا۔ قصی بہت ہی بااقبال انسان تھے۔ ان کی وجہ سے قریش میں چار چاند لگ گئے اور قریش کی دھاک پھر سے سارے عرب میں بیٹھ گئی۔

حضرت سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام کے بعد صدیوں تک خانہ کعبہ کی تولیت اور مکہ کی حکومت بنی جرہم کے قبضہ میں رہی۔ ان کے بعد عمالقہ کے قبضہ میں گئی عمالقہ کے بعد پھر دوبارہ بنی جرہم قابض ہو گئے۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد ان کا ہمشیرزاد بھائی ۔۔۔ بن لحی الخزاعی جو عرب میں بت پرستی کا بانی مبانی تھا۔ بنی جرہم کو مکہ سے نکال کر خود قابض ہو گیا۔ جب قصی مکہ پہنچے تو ابھی تک مکہ پر بنی خزاعہ کا قبضہ بدستور تھا۔

بنی خزاعہ کے سردار حُلیل کی بیٹی سے جس کا نام حُبّی تھا انھوں نے شادی کرلی۔ حلیل نے بیٹی کو جہیز میں کعبہ کی تولیت دی، اور ابوغشیان نامی ایک شخص کو بیٹی کا وکیل مقرر کر دیا۔ جب حلیل کا انتقال ہو گیا تو ابوغشیان نے اپنا حق شراب کے ایک مشکیزے کے عوض قصی کے ہاتھ بیچ دیا۔ اس طرح تقریباً ۴۴۰ء میں ہزاروں سال بعد تولیت کا حق حقدار کو پہنچا۔

بنوخزاعہ نے جب دیکھا کہ یہ شرف ہمارے ہاتھوں سے نکل رہا ہے۔ تو بہت پیچ وتاب کھلئے بالآخر لڑائی کی ٹھان لی۔ بنوخزاعہ کے ساتھ بنوبکر اور قریش کے معاون قضاعہ وکنانہ تھے۔

سخت جنگ ہوئی لڑائی میں دونوں طرف کے ہزاروں سورما مارے گئے آخر تھک کر دونوں نے تعمیر بن عوف کنانی کو اپنا حکم مانا۔ اس نے فیصلہ دیا کہ قصی بنوخزاعہ کے مقتولوں کا خوں بہادیں۔ بنوخزاعہ مکہ چھوڑ کر باہر نکل جائیں مکہ پر قصی حکومت کریں گے۔ اولاد فہر کی اس وقت بارہ شاخیں عرب کے مختلف نواح میں پھیلی ہوئی تھیں قصی نے مکہ کی حکومت حاصل کرنے کے بعد ان سب کو مکہ میں آباد کر کے ان کے منتشر شیرازے کو اکٹھا کر دیا۔ اس لئے قصی کو مُجَمِّع بھی کہتے ہیں۔

قصی لَعَمرِی کان یُدعیٰ مُجَمِّعًا   بہ جمع اللہ القبائل من فهر

قصی ہی کو مُجَمِّع کہا جاتا ہے۔ اسلئے کہ ان کے ذریعہ اللہ نے فہر کے قبائل کو اکٹھا کر دیا۔

قصی کو مولیٰ عزوجل نے دوررس دماغ عطا فرمایا تھا جس کی بدولت انھوں نے بڑے بڑے کام انجام دیئے۔ دنیا میں قصی ہی پہلے شخص تھے جنھوں نے جمہوری طرز کی ۴۴۰ئہ میں حکومت کی بنیاد ڈالی۔ مکہ کا مشہور دارالمشورہ "دارالندوہ" انھیں کا قائم کیا ہوا ہے۔ جہاں اہل مکہ اپنے خصوصی کاموں کے لئے جمع ہوتے تھے۔ جنگ کی تیاری، قافلہ تجارت کی روانگی، نکاح خوانی کی رسوم اسی عمارت میں سرانجام پاتیں۔ ایام حج میں حجاج کو پانی کی سخت دشواری پیش آتی تھی۔ انھوں نے اس کا بہت معقول بندوبست کیا۔ چرمی حوض بنوائے۔ حج کے ایام میں ان حوضوں کو پانی سے بھر دیتے تھے، جسے بلا روک ٹوک ہر شخص پیتا۔ حجاج میں کھانا تقسیم کرنے کے لئے "رِفادہ" کا محکمہ قائم کیا۔

قریش کی تمام شاخوں کو جمع کر کے تقریر کی۔ حُجاج کوسہا کوس سے بیت اللہ شریف کی زیارت کے لئے آتے ہیں۔ ان کی مہمانی ہم پر واجب ہے جس سے

سب متاثر ہوئے۔ اور سالانہ ایک رقم مقرر کر لی جس سے مکہ اور منیٰ میں حج کے ایام میں لنگر بٹتا۔ حج کے دنوں میں مشعر حرام پر چراغ جلانے کی رسم انھیں کی ایجاد ہے۔ حجابت، خانہ کعبہ کی کلید برداری، قیادت، کمانداری، لڑائیوں میں لوار انھیں کی ایجاد ہے۔

انھیں جلیل خدمات کی بدولت قصی کا سارے عرب میں رسوخ پیدا ہو گیا تھا۔ اور قریش کو غیر فانی شہرت حاصل ہو گئی۔

قصی کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ عبد مناف[1]۔ عبد الدار[2]۔ عبد العزیٰ[3] عبد بن قصی۔ لڑکیاں۔ تخمر[1]۔ برہ[2]۔

مرتے وقت قصی نے قریش کے تمام مناصب اپنے بڑے بیٹے عبد الدار کو دیئے جس کی وجہ سے ان کی اولاد میں جذبہ رقابت کے تحت نفاق کی بنیاد پڑ گئی۔

قصی کو مرنے کے بعد حجون میں دفن کیا گیا۔ بعض لوگوں نے کہا کہ قصی ہی کا لقب قریش ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں روافض کی من گھڑت ہے۔ تاکہ حضرت صدیق و فاروق کا قریشی ہونا ثابت نہ ہو سکے۔

عبدِ مناف

اصل نام مغیرہ تھا۔ مشہور عبد مناف کے ساتھ ہوئے، حسن و جمال میں یکتا تھے۔ اس لئے ان کو قمر البطحا بھی کہتے تھے، کنیت ابو عبد شمس ہے ماں کا نام حی بنت خلیل ہے۔ کتب سیر میں عبد مناف کی وجہ تسمیہ یہ لکھی ہے کہ ان کی ماں نے مناف نامی بت کی خدمت کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اس لئے عبد مناف سے مشہور ہو گئے لیکن یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ اس لئے کہ حجاز میں جتنے بت تھے۔ سب کی فہرست موجود ہے۔ ان میں مناف نام کا کوئی بت نہیں۔ جب اس نام کا کوئی بت نہیں تو اس کی خدمت کے لئے تقرر کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ قصی نے سب بھائیوں میں بڑا ہونے کی وجہ سے سرداری عبد الدار کو دی تھی۔ مگر وہ اپنی نااہلی کی وجہ سے اسے نباہ نہ سکا۔ اس لئے قریش کی سیادت باپ

کے بعد عبد مناف کو بھی۔

عبد مناف ان نیک بختوں میں ہیں۔ جو جاہلیت کے دور میں بھی لوگوں کو خدا ترسی حق شناسی کی تلقین کیا کرتے تھے۔

علامہ زرقانی نے موسیٰ بن عقبہ کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ ایک کتبہ پر یہ لکھا ہوا پایا گیا ہے۔

انا المغیرة بن قصی اٰمر بتقوی اللّٰہ و صلة الرحم وایای عنی القائل

میں مغیرہ بن قصیؔ ہوں۔ اللہ کے خوف اور صلہ رحمی کا حکم کرتا ہوں۔ میرے ہی بارے میں شاعر نے کہا ہے۔

کانت قریش بیضة فتقلقلت فالمخ خالصة بعبد مناف

قریش انڈا ہیں تو مغز خالص عبد مناف ہیں

ان کے پاس نزار کا جھنڈا اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی کمان تھی۔ نور محمدی کے اثر سے بے مثال حسین تھے۔ ان کے چھ بیٹے تھے۔

(۱) ہاشم (۲) مطلب (۳) عبد شمس (۴) نوفل (۵) ابو مرہ (۶) ابو عبیدہ اور چھ ہی بیٹیاں تھیں۔

۱۔ غاضرہ: ۲۔ مرہ: ۳۔ حنہ: ۴۔ ہالہ: ۵ قلابہ: ۶۔ ریطہ۔ ان کا انتقال شام کے مشہور شہر غزہ میں ہوا۔

ہاشم

عبد مناف کے بیٹوں میں اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے ہاشم اور ان کا مد مقابل ہونے کی وجہ سے اُمیہ نے غیر فانی شہرت حاصل کی بعض روایات میں ہے کہ ہاشم اور امیہ کا باپ عبد شمس جڑواں پیدا ہوئے۔ ہاشم کا پاؤں عبد شمس کی پیشانی میں چپکا ہوا تھا۔ علیحدہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ مگر ناکامی ہوئی۔ بالآخر تلوار استعمال کرنی پڑی۔ اس پر کسی نے کہا تھا کہ ان کی اولاد میں ہمیشہ تلوار چلتی رہے گی: بنی ہاشم و بنی امیہ کی کشمکش اور کشت و خون کی یہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔

مگر یہ روایت سخت محل نظر ہے اس لئے کہ جو جڑواں بچے ایک ساتھ پیدا ہوں یہ عادۃً محال ہے، ایک بچے کی پیدائش میں ماں کی جان پر بن آتی ہے۔ رحم کا منھ اتنا تنگ ہوتا ہے کہ دو بچے ایک ساتھ پیدا ہی نہیں ہو سکتے۔ تجربہ شاہد ہے کہ جڑواں بچے باری باری پیدا ہوتے ہیں۔

ہاشم کا نام عمرو تھا۔ مگر عمرو العلاء کے نام سے مشہور ہوئے۔ ایک بار مکہ میں قحط پڑا۔ لوگ بھوکوں مرنے لگے۔ اس وقت ہاشم شام بہ سلسلہ تجارت گئے ہوئے تھے۔ واپسی میں اونٹوں پر آٹا اور روٹیاں لادلائے۔ روٹیوں کو شوربے میں توڑ کر لوگوں کو کھلایا۔ جب تک قحط دور نہ ہوا ان کا دستر خوان نہ اٹھا۔ جب سے ہاشم مشہور ہوئے۔ ہشم کے معنی چورا کرنے کے ہیں۔ ان کی مدح میں ایک شاعر کہتا ہے۔

عمرو العلاء هشم الثريد لقومه ورجال مكة مستنون عجاف

عمرو العلاء نے ثرید بنا کر اپنی قوم کو کھلایا ایسی حالت میں کہ مکہ کے لوگ قحط زدہ دبلے تھے

ماں کا نام عاتکہ بنت مرہ بن حلیل ہے۔ عاتکہ سے یہ اور عبد شمس اور مطلب تھے۔ عبد مناف کی بقیہ اولاد واقدہ بنت عمرو مُزنیہ سے تھیں۔ ہاشم بھی اپنے باپ کی طرح بہت حسین وجمیل تھے۔ نور محمدی کی کرنیں ان کے چہرے سے پھوٹتی تھیں۔ اتنے بارعب تھے کہ اَحبار اِن کو دیکھتے تو بیساختہ ان کے ہاتھ کو بوسہ دیتے۔

علامہ زرقانی نے یہاں تک لکھا ہے کہ جس چیز کے قریب سے گزرتے انھیں سجدہ کرتی، سیر چشم ہر دل عزیز مرجع خلق تھے۔ عبد مناف کے مرنے کے بعد باپ کی نیابت کے لئے ان میں اور عبد شمس میں اختلاف ہوا۔ جب اختلاف شدت اختیار کر گیا تو عسقلان کے ایک کاہن کے پاس فیصلہ کے لئے گئے۔ اس نے ہاشم کے حق میں فیصلہ دیا۔

قصی نے تمام مناصب اپنے بڑے لڑکے عبدالدار کو دے دیئے تھے مگر وہ اپنی نااہلی کی وجہ سے کماحقہ تمام کام سرانجام نہیں دے پاتا۔ یہ ہاشم جیسے اولوالعزم غیور کو گراں گزرتا، انہوں نے بنی عبدالدار سے تمام مناصب حاصل کرنے پر اپنے بھائیوں کو آمادہ کیا۔ مطالبہ پر بنی عبدالدار نے انکار کیا۔ کشمکش اتنی بڑھی کہ دونوں طرف جنگ کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ آخر میں اس پر صلح ہوئی۔ کہ سقایا، ورفادہ، ہاشم کو دے دیئے جائیں۔ بقیہ مناصب بنی عبداللہ کے پاس رہیں۔ ہاشم بڑی مستعدی سے اپنی متعلقہ خدمت انجام دیتے۔ ایام حج میں بڑے حوصلے کے ساتھ حُجّاج کو کھانا کھلاتے۔ زمزم کے پاس اور منیٰ میں چمڑوں کے حوضوں میں پانی بھر کر رکھتے۔

اپنی پسماندہ قوم کو ترقی دینے کا جذبہ بہت تھا۔ اس سلسلے میں بہت اہم کام انجام دیئے۔ خط و کتابت کر کے قیصر روم و حبش کے نجاشی سے قریش پر سے تجارت کا ٹیکس معاف کرادیا۔ اہل عرب کا کاروان تجارت جاڑوں میں یمن اور گرمیوں میں شام و انقرہ تک جاتا۔ انقرہ قیصر روم کا پایۂ تخت تھا۔ جب قریش وہاں جاتے تو قیصر ان کی بہت آؤ بھگت کرتا۔ عرب کے بادیہ نشین لوٹ کھسوٹ میں کسی کے ساتھ رعایت نہ کرتے۔ ہاشم نے قبائل عرب میں دورہ کر کے ان سے معاہدہ کرلیا تھا کہ ہمارے قافلے کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہ کریں۔ قریش ان کی ضرورت کی چیزیں لے کر خود ان کے گھر پہنچ جایا کریں گے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کاروانِ قریش ہمیشہ لوٹ مار سے محفوظ رہا۔

ان کے چار بیٹے تھے۔ (۱)۔ عبدالمطلب (۲) صفی (۳) اسد (۴) فُضَیلہ۔ اور پانچ بیٹیاں تھیں (۱) رضیہ (۲) ضعیفہ (۳) شفا (۴) ال خالدہ (۵) حسنہ۔ حسب عادت تجارت کے لئے شام گئے۔ غزہ میں انتقال ہوگیا ابھی عبدالمطلب کی پیدائش بھی نہیں ہوئی تھی۔

. . . .

عبدالمطلب

شیبہ یا عامر نام تھا۔ شیبۃ الحمد اور عبدالمطلب سے مشہور ہوئے۔ پیدائشی طور پر کچھ بال سر کے سفید تھے۔ شیبہ کے معنی بڑھاپے کے ہیں، موئے سفید بڑھاپے کی نشانی ہے اسلئے شیبہ نام پڑا۔ عبدالمطلب نام پڑنے کی وجہ یہ ہوئی کہ ان کے والد ہاشم ایک بار شام تجارت کے لئے جا رہے تھے۔ راستے میں مدینہ طیبہ میں اتر پڑے۔ مدینہ کے مشہور و معروف قبیلہ بنی نجار کے مہمان رہے۔ اسی قبیلہ کی ایک لڑکی سلمیٰ سے شادی کرلی۔ واپسی میں سلمیٰ کو مکہ لائے۔ اخیر مرتبہ جب شام جانے لگے تو سلمیٰ کو بھی ساتھ لے گئے۔ مدینہ پہنچ کر سلمیٰ کو ان کے باپ کے گھر چھوڑا۔ خود شام چلے گئے۔ قضاء الٰہی۔ ہاشم تو وہیں سے دار البقاء کو سدھارے۔ سلمیٰ حاملہ تھیں۔ دن پورے ہونے پر عبدالمطلب پیدا ہوئے شیبہ نام رکھا گیا۔ یہ آٹھ سال ننہال میں رہے۔ ان کے چچا مطلب کو اپنے بھتیجے کی واپسی کا خیال ہوا۔ تو مدینہ پہنچے۔ اور کسی طرح چپکے سے ان کو لے کر مکہ آئے۔ جب مکہ میں داخل ہو رہے تھے عبدالمطلب اپنے چچا کے پیچھے میلے کچیلے کپڑے پہنے بیٹھے تھے۔ لوگوں نے سمجھا یہ مطلب کے غلام ہیں اور انھیں عبدالمطلب کہنا شروع کر دیا۔ یہ نام ایسا زبان زد ہوا کہ اصل حال معلوم ہونے پر بھی زبان سے نہ اترا۔

بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ ان کی خستہ حالی کی بنا پر خود مطلب نے شرم کی وجہ سے پوچھنے والوں کو یہ نہیں بتایا کہ یہ میرا بھتیجا ہے بلکہ یہ کہا "ھٰذا عبدی" یہ میرا غلام ہے اور عبدالمطلب مشہور ہو گئے۔

بعضوں نے کہا کہ چوں کہ ان کی پرورش مطلب نے کی تھی جو چچا تھے، اہل عرب کی عادت تھی کہ یتیم کو پرورش کنندہ کا عبد کہا کرتے تھے۔ اسی لئے عبدالمطلب مشہور ہوئے۔ اس کی صحت محل نظر ہے۔

ہاشم کے بعد مطلب اور مطلب کے بعد عبدالمطلب کو مکہ کی ریاست

ملی۔ عبدالمطلب کے مقابلے میں مکے کی سرداری کا دعویدار حرب بن امیہ حضرت امیر معاویہ کا دادا ہوا، فیصلہ کے لئے حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے باپ خَطّاب کے پاس معاملہ پہنچا۔ خَطّاب نے بڑے زوردار طریقے سے فیصلہ عبدالمطلب کے حق میں دیا۔ خَطّاب نے حرب سے خِطاب کر کے کہا۔

عبدالمطلب عقل وفہم میں، رعب وداب میں تم سے بڑھ چڑھ کر ہیں اس لئے مکے کی سرداری کے وہی لائق ہیں۔

حضرت عبدالمطلب بہت وجیہ، جسیم، قدآور، حسین وجمیل تھے۔ نور محمدی کے انوار پیشانی سے جھلکتے تھے۔ مشک کی خوشبو ان کے جسم سے اٹھتی تھی۔ بہت ہر دل عزیز وذی رعب تھے۔ اہل مکہ ان کے پورے مطیع ومُنْقاد تھے غایت تعظیم وتکریم سے پیش آتے تھے۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ ان کے حکم سے سرتابی کرتا۔ جود وسخا میں یکتائے زمانہ تھے۔ انسان تو انسان چرند وپرند تک ان کی فیاضی سے متمتع تھے۔ پہاڑ پر ان کا دسترخوان وحوش وطیور کے لئے بچھا رہتا۔ اسی لئے ان کو "مُطْعِمُ طَیْرِ السَّمَاء" کہتے ہیں۔ مستجاب الدعوۃ تھے۔ جب اہل مکہ پر کوئی افتاد پڑتی تو ان سے دعا کراتے۔ عرب میں پہلے وہ شخص ہیں جنھوں نے اپنے اوپر شراب حرام کی اور پہلے وہ شخص ہیں جنھوں نے وسمہ کا سیاہ خضاب لگایا۔

شادی

ایک دن مسجد حرام میں سوئے اور سو کر اٹھے تو اپنے کو عجیب حال میں پایا۔ آنکھوں میں سرمہ لگا ہوا ہے۔ بالوں میں تیل پڑا ہوا ہے۔ بدن میں بیش قیمت جوڑا ہے جمال وجلال میں چار چاند لگا ہوا ہے۔ متحیر ہو کر رہ گئے۔ مطلب انھیں ایک کاہن کے پاس لے گئے۔ اس نے انھیں

اس حال میں دیکھ کر کہا ان کی جلد از جلد شادی کر دو۔ مطلب نے ان کی پہلی شادی قیلہ سے کی۔ جن کے بطن سے حارث پیدا ہوئے۔ قیلہ کی وفات کے بعد ہندہ بنت عمرو سے نکاح کیا۔ آخر میں ہالہ بنت وہیب سیدالشہداء اسداللہ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی والدہ سے نکاح کیا۔

چاہ زمزم کی دوبارہ کھدائی

حضرت اسمٰعیل علیہ الصلوٰۃ والتسلیم جب تک حیات ظاہری میں رہے کعبہ کے وہی متولی رہے۔ ان کے بعد نابت ان کے بڑے بیٹے کو یہ منصب ملا۔ عدنان تک یہ منصب بنی اسمٰعیل میں رہا۔ عدنان کے بعد ۲۰۷ء میں بنو جرہم نے بنو اسمٰعیل کو مکہ سے نکال دیا۔ خود کعبہ کے متولی بن گئے۔ بنی جرہم کا ایک مشہور سردار عمرو بن حارث گزرا ہے۔ اس نے اپنے زمانے میں سرداری کے نشے میں بڑے بڑے مظالم شروع کر دیئے۔ مقیم و مسافر کو ستانے لگا۔ خانہ کعبہ کو جو نذرانے بھیجے جاتے تھے خود ہڑپ کر جاتا تھا اس کے مظالم سے تنگ آکر قبائل عرب اس کے استیصال کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ عمرو بن لحی خزاعی (بانی بت پرستی) کی سرکردگی میں متحدہ طور پر حملہ کر دیا۔ بنو جرہم کو مقابلے کی تاب نہ تھی۔ بھاگ کھڑے ہوئے اور یمن کی طرف چلے گئے۔

عمرو بن حارث نے بھاگتے بھاگتے یہ حرکت کی کہ حجر اسود رکن سے اکھاڑ کر اور غزال الکعبہ[1] و دیگر تبرکات مثلاً فدیہ اسمٰعیل علیہ السلام کے سینگ کچھ مخصوص تلواریں۔ زرہیں۔ سب کو چاہ زمزم میں ڈال کر اسے پاٹ دیا۔

---

[1] غزال الکعبہ ہرن کا زرین جڑواں مجسمہ جسے اسفندیار فارسی نے کعبہ پر نذر کیا تھا۔ منہ

کنوئیں کے نشان تک مٹا دیئے۔

حرم پاک میں ظلم و عدوان کی سزا میں اللہ عزوجل نے اُن پر آبلہ کی وبا نازل فرمائی جس سے کتنے ہلاک ہو گئے۔ جب مکہ ان سے خالی ہو گیا تو بنو اسمٰعیل پھر تھوڑے تھوڑے آکر مکہ میں آباد ہو گئے

اس وقت سے لے کر حضرت عبد المطلب کے زمانے تک چاہ زمزم کا پتہ نہ تھا۔ عبد المطلب کو مسلسل چار دن تک خواب میں چاہ زمزم کھودنے کا حکم ہوا۔ پہلے اشاروں میں پھر اخیر دن بالتصریح بتایا گیا۔ خواب میں ہی جگہ کی نشاندہی بھی کی گئی، کہ خون اور لید کے درمیان یعنی قربان گاہ پر جہاں چیونٹی کا سوراخ ہے۔ اور تمھارے سامنے جہاں ایسا کوا جس کی ایک ٹانگ سفید ہو چونچ مارے وہیں زمزم ہے۔

یہ اپنے بڑے لڑکے حارث کو لے کر کھودنے گئے (اس وقت سوائے ان کے کوئی اور اولاد نہ تھی) وہاں اساف و نائلہ نام کے دو بت نصب تھے یہیں قریش قربانی کیا کرتے تھے۔ قریش کو یہ گوارا نہ ہوا کہ ان کی قربان گاہ اور دیوتاؤں کے استھان کھودے جائیں۔ انھوں نے روک ٹوک کی۔ حارث نے سب کو بھگا دیا۔ باپ۔ بیٹے دونوں کام میں لگ گئے۔ تین دن کی محنت کے بعد کنوئیں کے آثار نمایاں ہو گئے۔ جب حضرت اسمٰعیل کی بنوائی ہوئی مَن نکلی تو عبد المطلب نے تکبیر پڑھی اب قریش دوڑے ہوئے آئے کہ ہمیں بھی اس شرف میں شریک کرو۔ عبد المطلب اس پر راضی نہ ہوئے جھگڑا بڑھا۔ قریش یہ کہتے تھے کہ یہ ہمارے باپ حضرت اسمٰعیل کا کنواں ہے۔ اس میں ہم بھی تمھارے برابر کے حقدار ہیں۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ سعد بن ہذیم کی کاہنہ کے پاس چلیں وہ جو فیصلہ کرے دونوں فریق مان لیں۔ دونوں طرف کے نمائندے اس کاہنہ کے پاس چلے۔ حجاز و شام کے مابین ایک خشک ریگستان میں عبد المطلب کے ساتھیوں کا پانی ختم ہو گیا جب پیاس

کی شدت بڑھی تو انہوں نے قریش سے پانی مانگا انہوں نے یہ بہانہ بنا کر انکار کر دیا۔ کہ اگر قریب میں پانی نہ ملا تو کہیں تمھارے ہی جیسا ہمارا بھی حال نہ ہو۔

عبدالمطلب نے اپنے رفقاء کو حکم دیا کہ سب لوگ اپنی اپنی قبریں کھود لو جو مرتا جائے اسے دفن کرتے جائیں۔ پورے قافلہ کے بے گور و کفن پڑے رہنے سے یہ بہتر ہے کہ ایک دو آدمی کا یہ حشر ہو۔ سب لوگ قبریں کھود کر موت کا انتظار کرنے لگے۔ مگر حضرت عبدالمطلب کو پھر خیال آیا کہ یوں پڑے رہنے سے بہتر ہے کہ سفر جاری رکھیں شاید قریب میں کہیں پانی مل جائے سب کو کوچ کا حکم دیا۔ حضرت عبدالمطلب نے جب اپنی سواری اٹھائی تو دیکھا کہ اس کی کھر کے نیچے سے میٹھے پانی کا چشمہ پھوٹ پڑا ہے۔ سب نے جوش مسرت میں نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ سواریوں سے اترے۔ خود پانی پیا۔ جانوروں کو پلایا۔ مشکیں بھریں۔ اپنے حریف قریشیوں کو بلایا۔ آؤ اس عطیہ ربانی سے تم بھی مستفیض ہو۔ قریش یہ دیکھ کر بول اٹھے۔ عبدالمطلب واپس چلو۔ اللہ عزوجل نے فیصلہ کر دیا۔ تم تنہا زمزم کھودو۔ حضرت عبدالمطلب واپس آکر زمزم کھودنے میں لگ گئے۔

جب کھودتے کھودتے دفن کردہ کعبہ کے تبرکات غزال زریں وغیرہ ملیں تو پھر قریش نے جھگڑا کھڑا کیا۔ کہ ان میں ہمارا بھی حق ہے۔ قرعہ اندازی کی ٹھہری قرعہ میں غزال زریں کعبہ کے نام اور تلواریں زرہیں حضرت عبدالمطلب کے نام نکلیں۔ قریش کے نام کچھ نہ نکلا۔ حضرت عبدالمطلب نے غزال زریں اور تلواریں کعبہ کے دروازے میں لگا دیا۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ پہلے وہ شخص جنھوں نے کعبہ پر سونا چڑھایا۔ عبدالمطلب ہیں۔

ان سب جھگڑوں سے نپٹنے کے بعد حضرت عبدالمطلب نے کھدائی کا کام پورا کیا۔ اس طرح سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام کے بعد حضرت عبدالمطلب کی

محنت سے پھر دنیا چاہ زمزم سے سیراب ہونے لگی۔

حضرت عبد اللہ

ان کی کنیت ابو احمد۔ ابو محمد، ابو قثم ہے۔ قثم بھی حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماء مبارکہ میں سے ہے۔ زمزم شریف کی کھدائی کے بعد حضرت عبد المطلب ایک دن حرم میں سو رہے تھے۔ خواب دیکھا۔ ایک درخت اگا ہے۔ اتنا بلند وبالا اور تناور کہ اس کی شاخیں آسمان تک اونچی اور شرق و غرب تک پھیلی ہوئی ہیں۔ آفتاب سے ستر گنا زیادہ روشن۔ عرب و عجم اس کے آگے سرنگوں ہیں۔ وہ لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جاتا اور بلند سے بلند تر ہوتا جاتا ہے۔ اس کی روشنی میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن کبھی چھپ جاتا ہے۔ کبھی ظاہر ہو جاتا ہے۔ قریش کے کچھ لوگ اس کی شاخیں پکڑ کر لٹک گئے ہیں۔ اور کچھ لوگ اسے کاٹنے کی فکر میں ہیں لیکن اسے کاٹنے کے ارادہ سے جب قریب ہوتے ہیں تو ایک حسین ترین جوان انھیں پکڑ کر ان کی پیٹھ توڑ دیتا ہے۔ آنکھیں پھوڑ دیتا ہے۔ عبد المطلب کہتے ہیں میں نے چاہا کہ اس کی کوئی شاخ پکڑ لوں مگر جب ہاتھ بڑھایا تو شاخ اونچی ہو گئی۔ میں نے پوچھا یہ کیا معاملہ ہے۔ جواب ملا جس کی قسمت میں شاخوں تک رسائی تھی وہ تم سے سبقت کر گئے۔

یہ خواب دیکھ کر گھبرا اٹھے۔ قریش کے کاہنوں سے تعبیر پوچھی۔ سب نے بالاتفاق بتایا اگر تم سچ کہتے ہو تو تمھاری نسل سے وہ ہستی عالم وجود میں آئے گی جو شرق و غرب کی مالک اور پیشوا ہوگی۔

حضرت عبد المطلب کا خیال تھا کہ یہ ابو طالب ہیں مگر جب حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو خود ابو طالب کہا کرتے بخدا یہ درخت ابو القاسم امین (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) ہیں۔ ان سے لوگ پوچھتے کہ پھر ایمان کیوں نہیں لاتے۔ جواب دیتے کہ گالی اور عار کے اندیشہ کی وجہ سے۔

اس کے بعد حضرت عبدالمطلب نے فاطمہ بنت عمرو سے نکاح کیا۔ انھیں کے بطن سے انوشیرواں کے ۲۴ سنہ جلوس میں حضرت عبداللہ پیدا ہوئے۔

آفتاب رسالت طلوع کی قریب ترین منزل پر پہنچ چکا تھا۔ اسکی کرنیں جبین عبداللہ پر سپیدہ سحر رحمت بن کر درخشاں تھیں۔ جس کی کشش سے مہ جبینانِ قریش کے قلوب حضرت عبداللہ کے لئے بے چین رہتے۔ ان دنوں عرب میں بے حیائی طرۂ ریاست تھا۔ جس کی رو میں کتنی عورتوں نے حضرت عبداللہ کو دعوتِ معصیت دی۔ لیکن اس پیکرِ عفت نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

ایک بار حضرت عبداللہ حرم شریف میں گئے۔ ایک عورت کعبہ کے قریب کھڑی تھی۔ جس کا نام رقیقہ یا قتیلہ تھا۔ اس نے حضرت عبداللہ سے کہا وہ سو اونٹ جو تمھارے فدیہ میں ذبح ہوئے تھے۔ مجھ سے لے لو اور میرا کہا مان لو۔ ایزدِ متعال کی امانتِ کبریٰ کے امین نے جواب میں یہ اشعار پڑھے۔

اما الحرام فالممات دونه	والحل لاحل فاستبینه
حرام سے موت بہتر ہے	حلال کو حلال جانتا ہوں لیکن اعلان چاہتا ہوں
فکیف بالامر الذی تبغینه	یحمی الکریم عرضه ودینه

تو جو چاہتی ہے وہ کیسے ہو سکتا ہے، شریف اپنی آبرو اور دین کو بچائے رکھتا ہے

اسی طرح ایک یہودیہ فاطمہ بنت مر الخثعمیہ نامی نے بھی حضرت عبداللہ کو فریب دینا چاہا تھا۔ یہ کاہنہ ہونے کے ساتھ ساتھ حسن وجمال میں یکتا اور دولت و مال میں ممتاز تھی۔ مگر حضرت عبداللہ نے جواب دیا باپ کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ اس قسم کی متعدد عورتوں کے بارے میں روایات آئی ہیں مگر ہر موقع پر صیانتِ الٰہیہ نے حضرت عبداللہ کو بچا لیا۔ کہ نور نبوت معصیت سے ملوث نہ ہو۔

سُنّتِ ابراہیمی کی تجدید

انا ابن الذبیحین

چاہ زمزم کی کھدائی سے عبدالمطلب کا تفاخر اوجِ ثریا تک جا پہنچا۔ جوش مسرت میں منت مانی۔ اگر دس بیٹوں کو جوان دیکھوں تو خدا کے نام پر ایک کی قربانی کروں گا۔ فضلِ ایزدی سے وہ دن بھی آیا کہ ان کے دس بیٹے ان کی موجودگی میں جوان ہوئے۔ جن میں حضرت عبداللہ بھی تھے۔ اتفاق کی بات منت یاد نہ رہی۔ ایک دن حرم میں سو رہے تھے۔ خواب دیکھا۔ کہنے والا کہتا ہے کہ عبدالمطلب اپنی منت پوری کرو۔ یہ گھبرا کر اٹھے اور ہانپتے کانپتے کہ سانس لینا دشوار تھا فوراً ایک دُنبہ ذبح کرکے فقراء پر تقسیم کر دیا۔ دوبارہ خواب دیکھا اس سے بڑی قربانی کرو۔ اب کی بار انھوں نے ایک گائے ذبح کی پھر خواب دیکھا۔ اس سے بھی بڑی۔ بیدار ہو کر اونٹ کی قربانی کی۔ پھر خواب میں کہا گیا اس سے بھی بڑی۔ دریافت کیا اس سے بڑی قربانی کیا ہے۔ جواب ملا۔ جوان بیٹا، جس کی منت مانی تھی۔

اب خواب سے بیدار ہو کر سخت متفکر تھے۔ مبادا جوان بیٹے اسکے لئے آمادہ نہ ہوں۔ سب کو جمع کیا خواب سنایا۔ رگوں میں اسمٰعیلی خون رکھنے والے سعادت مندوں نے اپنی گردنیں خم کر دیں۔ حضرت عبدالمطلب نے قرعہ ڈالا۔ اتفاق کی بات قرعہ آپ کی محبوب ترین اولاد حضرت عبداللہ کے نام نکلا۔

حضرت عبدالمطلب نے بلا چون وچرا حضرت عبداللہ کا ہاتھ تھاما اور چھری لے کر قربان گاہ پہنچ گئے۔ مکے میں شور مچ گیا۔ تمام قریش ٹوٹ پڑے حضرت عبداللہ کے ننھیال والے آڑے آئے۔ قریش کے روسا نے کہا کیا کر رہے ہیں؟ آپ کی دیکھا دیکھی سب لوگ اپنی اولاد لا لا کر ذبح کرنا شروع کر دیں گے۔ مگر عبدالمطلب اپنے ارادے سے باز نہ آئے۔ حضرت عبدالمطلب کا عزم محکم دیکھ کر قریش نے ایک تدبیر سوچی۔ عبدالمطلب سے کہا۔ حجازی کاہنہ کے پاس چلو اور وہ جو کہے اس پر عمل کرو۔ قریش کے اصرار کے آگے عبدالمطلب کو سپر ڈال دینی پڑی۔ اس کاہنہ کے پاس گئے۔ سب واقعہ بتایا اس نے کہا۔ کل آنا اپنے موکل سے پوچھ لوں۔ دوسرے دن یہ لوگ جب اس کاہنہ کے پاس پہنچے تو اس نے پوچھا تمھارے یہاں خوں بہا کی کیا مقدار ہے۔ قریش نے کہا دس اونٹ۔ کاہنہ نے کہا۔ دس اونٹ اور عبداللہ پر قرعہ ڈالو۔ اگر اونٹوں کے نام قرعہ نکلے تو اونٹوں کو ذبح کرو۔ ورنہ دس اور بڑھاؤ۔ اسی طرح دس بڑھاتے جاؤ۔ جب بجائے عبداللہ کے اونٹوں کے نام قرعہ نکلے تو سمجھ لو کہ اللہ عزوجل عبداللہ کے بجائے اونٹوں کی قربانی پر راضی ہے۔ مکہ واپس ہو کر قرعہ اندازی ہوئی۔ سو اونٹوں پر جا کر اونٹوں کے نام قرعہ نکلا۔ اطمینان کے لئے متعدد بار قرعہ اندازی ہوئی۔ جب بار بار قرعہ اندازی پر اونٹوں کے نام قرعہ نکلا تب کہیں جا کر حضرت عبداللہ کے فدیہ میں سو اونٹ ذبح کئے گئے۔ انسانوں کے علاوہ وحوش وطیور نے اس ضیافتِ الٰہیہ میں وافر حصہ پایا اُسی وقت سے خوں بہا کی مقدار سو اونٹ ہو گئی۔

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بعد حضرت عبداللہ کی اسی قربانی پر فخر کرتے ہوئے نورِ دیدۂ عبداللہ نے ارشاد فرمایا ہے۔ اَنَا ابنُ الذَّبِیحَین۔

ایک شبہہ کا ازالہ

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بعد حضرت عبداللہ کی قربانیوں پر آج اعتراض کیا جاتا ہے کہ اولاد کو قتل کرنا انتہائی سفاکانہ و وحشیانہ فعل ہے اس میں شک نہیں کہ جو لوگ عابد و معبود خالق و مخلوق کے تعلق سے واقف نہیں وہ اس تسلیم و رضا کی حقیقت کو ہرگز نہیں سمجھ سکیں گے انھیں یہ قربانیاں وحشت و بربریت ہی نظر آئیں گی۔ لیکن جو لوگ وجود باری کے قائل ہیں اور اپنی حیات و ممات اور ان کے سارے انقلابات کو ماورائے عقل ایک بالادست ہستی کے زیر تصرف جانتے ہیں وہ اپنی جان و مال اہل و عیال اس کے حکم کے بعد اس کے نام پر قربان کرنے کو انسانیت کی معراج سمجھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ دنیا کے ان تمام مذاہب میں جو وجود باری کے قائل ہیں اولاد کی قربانی کسی نہ کسی عنوان سے موجود ہے۔ علاوہ مسلمانوں کے یہود و نصاریٰ کو لیجئے تو ان کے یہاں بھی حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اپنی کسی اولاد کو قربان کرنے کا قصہ فضائلِ ابراہیمی میں موجود ہے۔ افریقہ یونان۔ ہندوستان۔ چین کے تمام ممالک میں یہ رسم جاری تھی۔ اور ہندوستان میں انگریزوں کی عملداری تک موجود تھی۔ افریقہ اور نیپال کی بہت سی پہاڑی قوموں میں اب تک باقی ہے۔

اصل راز یہ ہے کہ مذاہب اپنے اندر کتنے ہی اختلاف رکھتے ہوں لیکن ایک تصور سب میں مشترک ہے کہ انسان کی جان و مال آل و اولاد سب اس کے معبود کا عطیہ ہے وہی انسان اور انسان کی کل کائنات کا مالک حقیقی ہے اسے اختیار کلی حاصل ہے کہ ہماری جان، مال، آل، اولاد کو جب چاہے واپس لے لے اور ان کا جو چاہے مصرف مقرر فرمادے۔

لَہٗ مَا اَخَذَ وَمَا اَعْطٰی۔ اسی کا ہے جو لیا اور اسی کا ہے جو دیا

اسی بنا پر تمام مذاہب میں خیرات، صدقات، دان پُن فریضۂ الٰہی کے طور پر موجود ہے، جس طرح اس مالک علی الاطلاق کو یہ اختیار ہے کہ ہماری کمائیوں سے جتنا چاہے اپنے نام پر لے لے اسی طرح اسے یہ بھی اختیار ہے کہ اپنے نام پر ہماری جان کی بھی قربانی طلب کرے جس طرح مال لٹانا ان کے لئے باعث کمال ہے اسی طرح اس کی رضا جوئی کے لئے اپنی جان قربان کر دینا وحشت و بربریت نہیں مایۂ صد افتخار ہے، اسی اعتقاد کے مطابق تمام مذاہب میں مال کے ساتھ ساتھ جان کی قربانیوں کا دستور قائم ہوا۔

تاریخ عالم کو اٹھا کر دیکھو جب کوئی بادشاہ کسی کو سلطنت کا اہم منصب دینا چاہتا ہے تو پہلے اس کے خلوص و محبت جذبۂ انقیاد و جاں سپاری کو طرح طرح آزماتا ہے۔ اسی طرح بندگان الٰہی کو روحانی عہدے اور مناصب کے لئے بڑے بڑے جانی و مالی امتحانات دینے پڑتے ہیں۔

اس کی توضیح میں حضرت ابراہیم کے علاوہ حضرت یوسف حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام کی سوانح حیات موجود ہیں۔ یہ امتحان ہی تو تھا کہ حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام کو والد ماجد کی بھرپور آغوش سے جدا ہو کر چاہ کنعان میں اور چاہ کنعان سے مصر کے بازار میں اور مصر کے بازار سے عزیز مصر کی غلامی میں مبتلا ہونا پڑا۔ یہ امتحان ہی تو تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو پیدا ہوتے ہی دریا کی موجوں سے اور جوان ہوتے ہی ترک وطن سے دوچار ہونا پڑا یہ امتحان ہی تو تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو زندگی بھر کہیں چین نہ ملا آخر دار و رسن کی نوبت پہنچی ان امتحانات کے بعد جو مناصب انھیں ملے ان کے مقابلے میں یہ امتحانات ہیچ ہیں۔

حضرت ابراہیم کو خلت کا عہدۂ جلیلہ دینا تھا تو پیدائش سے پہلے ہی جان خطرے میں پڑی۔ عہد طفلی میں تہہ خانے میں رہے۔ قید و بند کی

صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ آتش کدۂ نمرود میں جانا پڑا، ترک وطن کرنا پڑا۔ ناموس خطرہ میں پڑا ان سب میں کامیابی کے بعد ابھی ایک منزل باقی تھی انسان پر بہت سے ایسے مواقع آتے ہیں کہ اپنی جان تک دے دینی آسان سمجھتا ہے لیکن کسی کی رضا جوئی کے لئے اپنے جگر پارے کے گردن پر چھری چلانا وہ کٹھن منزل ہے جس پر بہ مشکل قدم جمتا ہے لیکن حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا جو منصب تھا وہ اس کا مقتضی تھا کہ تمام علائق دنیوی سے انقطاع کلّی کا ثبوت پیش کریں۔ اس لئے اکلوتی اولاد کی گردن پر چھری چلانے کا حکم ہوا دنیا نے دیکھ لیا کہ اللہ تعالیٰ کا خلیل اس محیّر العقول امتحان میں بھی اعلیٰ طور پر کامیاب رہا۔ قدرت حضرت اسمٰعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خون کی طالب نہ تھی۔ بلکہ باپ بیٹے کے جذبۂ تسلیم و انقیاد کو آزمانا چاہتی تھی۔ چنانچہ تسلیم و رضا کے مراحل طے ہوتے ہی اعلان کردیا۔

قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ

اے ابراہیم، بس تم نے اپنا خواب پورا کر دکھایا۔ ہم نکوکاروں کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں۔

امتحان ہوچکا اپنے جلیل عہدے کا پروانہ لو۔

رہ گئے حضرت عبدالمطلب اگرچہ جاہلیت کی ظلمات میں تعلیمات ابراہیمی کے انوار چھپ گئے تھے۔ لیکن گھنی گھٹاؤں کے گھر جانے کے بعد بھی آفتاب کی اتنی روشنی تو رہتی ہی ہے کہ انکھیارا رات دن میں تمیز کرلیتا ہے۔ ان کے دل میں اسوۂ ابراہیمی کی اتباع کا جذبہ کارفرما تھا تو جیسے وہ امر محمود ہے یہ بھی ہے جیسے وہ موجب ستائش ہے باعث صد عز و شرف ہے یہ بھی ہے۔

ایک اور موشگافی

اس موقع پر بعض لوگوں نے یہ بھی موشگافی کی ہے کہ یہ خواب تمثیلی تھا۔ ذبح ابن سے خدمت کعبہ کے لئے وقف کرنا مراد تھا۔ لیکن حضرت ابراہیم

نے خطائے اجتہادی سے اس خواب کو عینی سمجھا اور بیٹے کو ذبح کرنے پر تل گئے۔ یہی وجہ ہے کہ عین موقع پر ان کو روک دیا گیا۔ اس تاویل کی تائید میں دو باتیں پیش کی گئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ انبیا علیہم السلام کو عینی و تمثیلی دونوں قسم کے خواب دکھائے جاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ توراۃ میں جا بجا قربانی کا لفظ وقف علی المعبد کے معنی میں آیا ہے۔

اس سے انکار نہیں کہ انبیاء علیہم السلام کو عینی کی طرح تمثیلی خواب بھی دکھائے جاتے ہیں اور نہ اس سے انکار ہے کہ توراۃ میں قربانی کا لفظ اس معنی میں آیا ہے لیکن اس سے ضرور انکار ہے کہ حضرت خلیل اللہ کا یہ خواب تمثیلی تھا اور اس خواب میں ذبح سے خدمت کعبہ کے لئے وقف مراد تھا اور یہ انکار مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر ہے۔

۱ــــــ نصوص میں اصل یہ ہے کہ اس کے معنی حقیقی مراد لئے جائیں جب تک اس کے خلاف کوئی قرینہ صارفہ نہ پایا جائے ورنہ امان اٹھ جائے جس کا جی چاہے جہاں چاہے بجائے معنی حقیقی کے مجازی مراد لے کر تمام شریعت کو پائمال کر کے رکھ دے یہاں آیت کے سیاق و سباق دیکھنے سے ظاہر ہے کہ معنی حقیقی کے خلاف کوئی قرینہ نہیں تو بلا ضرورت داعیہ اس سے وقف علی الکعبہ مراد لینا تفسیر قرآن نہیں تحریف معنی ہے۔

۲ــــــ اگر یہ خواب تمثیلی تھا تو قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا نہ فرمایا جاتا۔ قد اخطئت فی فهم الرءیا فرمایا جاتا۔ بیٹے کی گردن پر چھری چلانے والے سے یہ نہ فرمانا کہ تم نے اپنا خواب سمجھنے میں غلطی کی بلکہ یہ فرمانا کہ تم نے خواب سچ کر دکھایا اس بات کی دلیل ہے یہ خواب عینی تھا تمثیلی نہیں۔

۳ــــــ توراۃ میں وقف علی المعبد کے معنی میں لفظ قربانی آیا نہ کہ لفظ ذبح۔ ماہرین لغت جانتے ہیں کہ قربانی اور ذبح میں کتنا فرق ہے

قربانی اور وقف علی المعبد میں علاقہ ہے لیکن ذبح اور وقف علی المعبد میں کوئی علاقہ نہیں بلکہ تنافی ہے وقف بقا چاہتا ہے اور ذبح کے لئے فنا لازم ہے۔

۴ــــــ پھر یہ کہ نظم قرآن کی تفسیر محاورات توراۃ سے کرنا کہاں تک درست ہے اسے ہر عاقل سمجھ سکتا ہے وہ بھی اس صورت میں جب کہ توراۃ کا اکثر حصہ محرّف ہو چکا ہے۔

۵ــــــ ان سب باتوں سے قطع نظر اس قربانی کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ۔ بلاشبہ یہ کھلا ہوا امتحان ہے۔ ظاہر ہے کہ ذبح سے مراد وقف علی المعبد لیں تو یہ کھلا ہوا امتحان سرے سے امتحان ہی نہیں رہ جاتا لیکن اگر ذبح کے معنی حقیقی مراد لئے جائیں تو پھر یہ امتحان امتحان ہے اور یقیناً اتنا بڑا کہ اس کی رفعتوں کے حضور ملائکہ کے بھی سر خم ہیں۔

شادی

کتب سماویہ میں نبی آخر الزماں کے مبعوث ہونے کا وقت آبار واجداد کے کوائف حلیے مذکور تھے حضرت عبداللہ میں ان علامتوں کو دیکھ کر اہل کتاب تاڑ گئے تھے کہ کنز مخفی کا دُرِّ یکتا انھیں کے پشت میں مکنون ہے۔ انھیں حسد ہوا کہ بنی اسرائیل اس سے محروم رہے۔ اس تاک میں رہتے تھے کہ کسی صورت حضرت عبداللہ کو قتل کر دیں۔ شام کے اہل کتاب کی ایک جماعت مسلح ہو کر اس مقصد کے لئے مکہ کے جنگلوں میں آکر چھپ رہی۔ ایک دن حضرت عبداللہ شکار کے لئے گئے۔ یہ کمینے کمین گاہ سے نکل کر حملہ آور ہوئے۔ ان کے حملہ کرتے ہی غیب سے کچھ سوار نمودار ہوئے اور انھیں دفع کیا۔ وہیب بن عبدمناف یہ سب منظر دیکھ رہے تھے۔ انھیں اپنی بھتیجی آمنہ کے لئے کسی شریف بر کی تلاش تھی۔ اس واقعہ نے انھیں حضرت عبداللہ کی جانب متوجہ کر دیا اور ان کی نگاہِ انتخاب حضرت عبداللہ پر پڑی۔ گھر آکر مشورہ کیا۔ اور حضرت عبدالمطلب کے پاس اپنے کچھ دوستوں کو منگنی کے لئے بھیجا۔ ادھر حضرت عبدالمطلب کو بھی جوان بیٹے کی شادی کی فکر تھی۔ آمنہ حسب ونسب حسن و

جمال میں ممتاز تھیں۔ حضرت عبدالمطلب کو کیا عذر ہوتا منظور فرمالیا اور حضرت عبداللہ کی حضرت آمنہ کے ساتھ شادی ہوگئی۔

اسی موقع پر حضرت عبدالمطلب نے ہالہ بنت وہیب، حضرت آمنہ کی چچازاد بہن سے عقد کیا۔ انھیں کے بطن سے حضرت حمزہ ہیں۔

عامۂ کتب سیر میں یہ مذکور ہے کہ حضرت آمنہ کا عقد خود ان کے باپ وہب نے کیا تھا مگر یہ صحیح نہیں۔ ان کا انتقال بہت پہلے ہو چکا تھا۔ حضرت آمنہ کی پرورش اُن کے چچا وہیب نے کی تھی اور شادی بھی انہوں نے کی تھی۔ (مدارج)

حضرت آمنہ بنی زہرہ کی چشم و چراغ تھیں ان کا نسب ماں کی طرف سے قصیّ پر حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے۔ عرب کا دستور تھا کہ شادی کے بعد دولہا تین دن سسرال میں رہتا تھا۔ حضرت عبداللہ بھی اسی رسم کے مطابق تین دن سسرال میں رہے۔ شادی کے وقت ان کی عمر تقریباً سترہ سال تھی۔

شادی کے پہلے ہی ہفتہ میں رب العٰلمین کی امانت کبریٰ حضرت آمنہ کو تفویض ہوگئی۔ قولِ راجح کی بنا پر رجب کی ابتدائی تاریخ اور جمعہ کی شب تھی۔

وفات

حضرت عبداللہ کی تاریخ وفات کے بارے میں علمائے سیر مختلف قول نقل کرتے ہیں۔ سب میں راجح یہ ہے کہ حضرت عبداللہ کی وفات ولادت مبارکہ سے پہلے ہی ہوگئی تھی۔ حاکم نے قیس بن مخرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بطن مادر ہی میں تھے کہ حضور کے والد ماجد کا انتقال ہوگیا۔ حاکم نے اسے علیٰ شرط مسلم صحیح کہا ہے۔ یہی امام امام مغازی ابن اسحٰق، امام واقدی، ابن سعد، بلاذری اور امام ذہبی کا قول ہے وجہ ترجیح ظاہر ہے کہ یہ ایک صحابی کا قول ہے۔ جو بروایت صحیحہ مروی ہے۔ نیز واقعات ولادت میں حضرت عبداللہ کا

کہیں کوئی تذکرہ نہیں جب کہ تمام جزئیات مُشرّح ہیں۔

حسب دستور حضرت عبداللہ قریش کے کاروان تجارت کے ساتھ شام کے مشہور شہر غزہ گئے۔ واپسی میں بیمار ہوگئے اس لئے مدینہ میں اپنے والد کے ننیہال بنی نجار میں رُک گئے۔ ایک ماہ علیل رہ کر وفات پاگئے۔ دار نابغہ میں مدفون ہوئے۔ قافلہ والے جب مکہ واپس ہوئے اور حضرت عبدالمطلب کو ان کی بیماری کا حال سنایا تو انہوں نے خبر گیری کے لئے اپنے بڑے بیٹے حارث کو بھیجا۔ انھوں نے واپس ہوکر وفات کی خبر سنائی تو سارا گھر ماتم کدہ بن گیا۔ حضرت آمنہ نے ایسا پُر درد مرثیہ کہا ہے کہ سن کر آج بھی دل پر چوٹ لگتی ہے۔ حضرت عبداللہ کی وفات پر فرشتوں نے غمزدہ ہوکر بارگاہ الوہیت میں عرض کیا۔ الٰہی تیرا نبی یتیم ہوگیا، جواب ملا۔ کیا ہوا میں اس کا حافظ و حامی ہوں۔

حضرت عبداللہ نے ترکہ میں اونٹ بکریاں اور ایک لونڈی چھوڑی تھی جن کا نام ام ایمن ہے۔ ام ایمن کا اصلی نام برکہ تھا۔ یہ سب ترکہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ملا۔
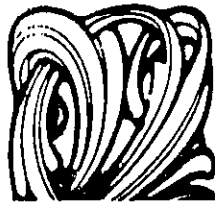
ارہاصات

قبل نبوت خوارق عادات

انبیاء علیہم السلام سے قبل نبوت جو خوارق عادات صادر ہوتے ہیں انھیں اصطلاح شرع میں ارہاص کہتے ہیں۔ اور بعد نبوت "معجزہ"۔

تمام کتب سیر مملو ہیں کہ حضرت آمنہ کے بطن پاک میں نور نبوت کے جلوہ گر ہوتے ہی عجیب و غریب محیر العقول باتیں ظہور میں آنے لگیں۔ ان میں سب سے عظیم و نمایاں اصحاب فیل کی بربادی ہے جس کی تفصیل یہ ہے۔

واقعہ فیل

بیت اللہ (کعبہ) کی وجہ سے اہل مکہ خصوصاً قریش کو جو عزت نصیب تھی اس پر ارد گرد کے بادشاہوں کو بھی رشک و حسد تھا۔ مکہ کی اس دینی مرکزیت کو ختم کرنے کے لئے یمن کے بادشاہ ابرہۃ الاشرم نے صنعا میں ایک معبد بنوایا۔ قصر بلقیس کے ملبہ سے قسم قسم کے رنگین پتھر منگائے۔ سفید، زرد، سرخ، سیاہ، چتی داران سے عمارت تیار کر کے سونے، چاندی جواہر سے منقش کیا اس میں صلیب آویزاں کی۔ ہاتھی دانت اور آبنوس کا منبر بنوایا۔ اس کا نام قلیس رکھا۔ اتنا اونچا تھا کہ دیکھنے والوں کی ٹوپیاں گر پڑتی تھیں! اسکی چھت سے عدن دکھائی پڑتا تھا۔

جب یہ کلیسا بن کر تیار ہو گیا تو ابرہہ نے اپنے ماتحت علاقے میں منادی

کرادی کہ اب کوئی حج کے لئے مکہ نہ جائے۔ مکہ کے بجائے صنعا کے قلیس کا حج کریں۔ اس کا علم جب اہل مکہ کو ہوا تو قبائلیانہ جذبہ سے مشتعل ہو کر ایک کنعانی نے جا کر قلیس میں پاخانہ کر کے اسے گندہ کر دیا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ نفیل خثعمی نے اس میں مردے ڈالے اور کچھ لوگوں نے اسے جلا دیا اس پر ابرہہ آگ بگولا ہو گیا اور قسم کھائی کہ کعبہ کا ایک ایک پتھر اکھاڑ کر دم لوں گا۔ اس ناپاک مقصد کے لئے ساٹھ ہزار کا ایک لشکر جرار تیار کر کے ہاتھیوں کے ساتھ مکہ کی طرف چل پڑا۔

راستے میں یمن کے ایک رئیس ذو نفر نے روکنا چاہا۔ نوبت جنگ تک پہنچی۔ ذو نفر شکست کھا کر زندہ گرفتار ہوا۔ پھر نفیل بن حبیب خثعمی نے مزاحمت کی یہ بھی پسپا ہو کر گرفتار ہوا۔ ابرہہ نے اسے قتل کرنا چاہا تو اس نے جان بچانے کے لئے کہا مجھے قتل مت کر عرب تک رہبری کا کام انجام دوں گا۔ ابرہہ نے جان بخشی کی اس کی رہنمائی میں ابرہہ جب طائف پہنچا تو وہاں کا رئیس مسعود بن معتب ثقفی کچھ آدمیوں کے ساتھ ملا۔ اور اظہار اطاعت کے بعد ابورغال کو ہمراہ کیا۔ کہ ابرہہ کو مکہ تک پہنچائے یہ غدار مغمس پہنچ کر مر گیا۔ وہیں اس کی قبر ہے۔ اہل عرب جب اس کی قبر سے گزرتے ہیں تو اس پر پتھر برساتے ہیں۔

ابرہہ نے مغمس میں پہنچ کر پڑاؤ ڈال دیا۔ یہیں سے اسود بن مقصود کے ہمراہ کچھ سوار بھیجے جو اہل مکہ کے مویشی پکڑ لائے۔ جن میں حضرت عبدالمطلب کے بھی چار سو اونٹ تھے۔ حضرت عبدالمطلب کو جب اس کی خبر ملی تو ابرہہ کے پاس تشریف لے گئے۔ ان کی بارعب پرشکوہ صورت کو دیکھتے ہی ابرہہ تخت سے اتر پڑا۔ زمین پر فرش پر بیٹھا اور حضرت عبدالمطلب کو بھی اپنے برابر بٹھایا۔ آمد کی غرض پوچھی۔ حضرت عبدالمطلب نے اپنے اونٹوں کے لئے کہا۔ ابرہہ نے حیرت سے کہا۔ میں سمجھتا تھا کہ مکہ کا سردار کوئی ذی عقل

انسان ہوگا تم تو نرے احمق نکلے۔ میں کعبہ ڈھانے آیا ہوں جو تمہارا معبد اور شان و شوکت کا مرکز ہے اس کی فکر نہیں مویشیوں کی فکر ہے۔

حضرت عبدالمطلب نے فرمایا۔ اونٹ میرے ہیں اس لئے مجھے ان کی فکر ہے۔ کعبہ رب العلمین کا ہے وہ خود اس کی حفاظت فرمائے گا۔ اس جواب سے ابرہہ بہت متاثر ہوا۔ اور ان کے اونٹ واپس کر دیئے حضرت عبدالمطلب نے ان تمام اونٹوں کو قلادہ پہناتے ان پر جُل ڈالے ان کے کوہان پر نشان بنائے اور انھیں حرم میں قربانی کے لئے چھوڑ دیا۔ ابرہہ کی لشکر کشی سے قریش کو سخت تشویش تھی۔ ابرہہ سے مقابلے کی ان میں تاب نہ تھی۔ کہاں ایک باقاعدہ حکومت کی کیل کانٹوں سے لیس آراستہ پیراستہ منظم ساٹھ ہزار فوج جرار اور کہاں یہ مٹھی بھر تہی دست بے سروسامان۔

اہل مکہ نے حسب دستور پہاڑ پر جاکر حضرت عبدالمطلب کے وسیلہ سے دعا مانگی۔ اثنائے دعا میں حضرت عبدالمطلب کی پیشانی پر ہلالی شکل کی تجلی پیدا ہوئی اتنی تیز کہ اس کی کرنیں بیت اللہ پر پڑیں۔ اسے دیکھ کر عبدالمطلب نے فرمایا۔ یہ نشانِ ظفر ہے اطمینان رکھو اب کوئی اندیشہ نہیں۔ پھر سب اہل مکہ کو ہدایت کی کہ یہ پہاڑوں میں چلے جائیں۔ خود مکہ ہی میں رہے نشانِ ظفر دیکھنے کے بعد بھی حضرت عبدالمطلب کو چین نہ تھا۔ درِ کعبہ کا حلقہ ہاتھ میں لے کر نہایت رقت کے ساتھ یہ دعا مانگی۔

لاھم ان المرء یمنع رحلہ فامنع رحالک

اے اللہ۔ ہر شخص اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے۔ تو بھی اپنے گھر کی حفاظت فرما۔

وانصر علی اٰل الصلیب	وعابدیہ الیوم اٰلک
صلیب کے پجاریوں کے مقابلے میں	اپنے اطاعت شعاروں کی مدد فرما
لا یغلبن صلیبھم ومحا	لھم ابدا محالک
ان کی صلیب اور فوج	تیری فوج پر ہرگز غالب نہ آئے

جروا جمیع بلادھم والفیل کی یسبوا عیالک

اپنی پوری آبادی اور ہاتھی گھسیٹ لائے ہیں تاکہ تیری ظلِ حمایت میں رہنے والوں کو گرفتار کریں

عمدوا محالک بکیدھم جھلا وما رقبوا جلالک

اپنی جہالت کی وجہ سے اپنے مکر کیساتھ تیرے حرم کا انہوں نے قصد کیا اور تیرے جلال سے نہ ڈرے

دعا کے بعد حضرت عبد المطلب ایک اونچی جگہ کھڑے ہو گئے کہ دیکھیں پردۂ غیب سے کیا نمودار ہوتا ہے۔ زرقانی میں ہے کہ ابو مسعود ثقفی بھی حضرت عبد المطلب کے ساتھ تماشا دیکھنے کے لئے کھڑا تھا۔

اصحابِ فیل کی پیش قدمی

ابرہہ نے صبح تڑکے لشکر درست کر کے ایک آزمودہ کار سردار حُناط حمیری کی سرکردگی میں مکہ کی طرف بھیجا۔ آگے آگے ہاتھیوں کا جھنڈ تھا۔ جن کا سرخیل فیلِ سفید "محمود" نامی تھا۔ یہ دل بادل جب مکہ کے قریب پہنچا اور سالار لشکر کی نظر عبد المطلب کے پرشکوہ چہرے پر پڑی تو وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ اور یوں چیخنے لگا جیسے ذبح کے وقت جانور چلاتا ہے ہوش میں آنے کے بعد حضرت عبد المطلب کے سامنے سجدہ میں گر پڑا۔ اور کہا میں شہادت دیتا ہوں کہ تم قریش کے سردار ہو۔

یہی حال فیلِ سفید کا ہوا۔ جیسے ہی حضرت عبد المطلب کے روبرو ہوا۔ بیٹھ گیا۔ پھر سجدے میں گر گیا۔ حالانکہ یہ اتنا سرکش تھا کہ کبھی ابرہہ کے بھی آگے نہیں جھکا تھا۔ جب کہ دوسرے ہاتھی اسے سلامی میں سجدہ کیا کرتے تھے۔ اللہ عزوجل نے فیلِ سفید کو گویائی عطا فرمائی اس نے نورِ محمدی پر سلام پڑھا۔ پھر اُٹھ گیا۔ ہر چند آنکس مارے گئے مگر نہ اٹھا مکہ کے علاوہ جدھر موڑتے بھاگتا۔ جب مکہ کی طرف پھیرتے بیٹھ جاتا۔ جب مہاوت نے بہت دِق کیا تو یمن کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ امیہ بن صلت کہتا ہے۔

ان ایات ربنا بینات مایماری بھن الا الکفور
ہمارے پروردگار کی نشانیاں بالکل ظاہر ہیں جن کا انکار سوائے کافر کے کوئی نہیں کرتا

جلس الفیل بالمُغمّس حتٰی ظل یحبو کانہ معقور
مغمس میں ہاتھی بیٹھ گیا۔ یوں گھسٹنے لگا گویا اس کے ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے ہیں

اصحاب فیل کی تباہی

ان عظیم نشانیوں کے دیکھنے کے بعد بھی جب ان مُتمرِّدین کے ارادے تبدیل نہ ہوئے تو وقت آگیا کہ انھیں پوری سزا دی جائے۔ اس کے لئے اس قادر مطلق نے سمندر کی طرف سے چھوٹے چھوٹے پرندوں کی فوج بھیجی جن کے چنگلوں اور چونچوں میں مسور کے برابر کنکریاں تھیں۔ ان پرندوں نے ابرہہ کے لشکر پر سنگ باری کی جس سے تمام لشکر پامال ہوگیا۔ سنگریزہ سر پر پڑتا خود کو پھاڑ کر سر میں گھستا اور بدن کو چیر کر پار ہو جاتا۔ یہی نہیں سواروں کے بعد سواریوں کو چھیدتا ہوا زمین پر پہنچتا۔ ہر سنگریزہ پر اس کا نام کندہ تھا جسکے حصے کا وہ ہوتا۔ ابرہہ کا حصہ بھی اس کے سر پر پڑا۔ اس کے اثر سے اسے چیچک نکل آئی۔ پور پور سڑ گل کر گرا۔ اخیر میں دل پھٹا اور زمانہ تک رسوائی اور طرح طرح کی اذیت کے بعد ہلاک ہوا۔ اس عذاب الٰہی کی تاب نہ لا کر پوری فوج سراسیمہ ہو کر بھاگ کھڑی ہوئی مگر بھاگ کر کہاں جاتی۔

این المفر والا لہ الطالب والاشرم المغلوب لیس الغالب
بھاگنے کی جگہ کہاں اللہ پکڑنے والا ہے ہونٹ کٹا نکٹا شکست خوردہ پسپا ہے

سب کے سب وہیں ڈھیر ہو کر رہ گئے۔ کعبہ ڈھانے کا حوصلہ رکھنے والے سورماؤں کی تڑپتی ہوئی لاشوں سے وادی مکہ پٹ گئی۔ نعوذ باللہ من غضبہ وغضب رسولہ۔

صرف ابرہہ کا وزیر ان کی تباہی کی داستان سنانے کے لئے حبشہ

واپس ہوا۔ نجاشی کے دربار میں پہنچا۔ سب کیفیت بیان کی ایک پرندہ اسکے ساتھ ساتھ تھا۔ جب پوری داستان سنا چکا اس نے سنگ ریزہ مارا اور یہ بھی وہیں تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔

ایک روایت میں ہے کہ فیل سفید اور اسکا مہاوت اور سائیس بچ گئے۔ یہ دونوں زندہ تو رہے مگر مردہ سے بدتر، اندھے اپاہج ہو گئے۔ مکہ میں عرصہ تک عبرت کی تصویر بن کر بھیک مانگ کر زندگی کے دن پورے کئے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں۔ میں نے خود ان کو اس حال میں بھیک مانگتے دیکھا ہے۔

جب ابرہہ اور اس کی فوج کا کام تمام ہو گیا تو حضرت عبدالمطلب اپنے آدمیوں کے ساتھ گئے اور ان کے اموال اور مویشی پر قبضہ کیا۔ اللہ عزوجل نے سیلاب بھیجا جو ان کی ناپاک لاشوں کو بہا کر سمندر میں پھینک آیا۔

ارہاصاتِ نبوت کی فہرست میں اصحاب فیل کی تباہی سب سے اعظم و روشن ہے اسی لئے قرآن کریم نے اس کی طرف خاص طور پر متوجہ فرمایا ہے۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۞ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ۞ وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۞ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ۞ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۞ (سورۃ الفیل)	اے محبوب کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے ہاتھی والوں کا کیا حال کیا کیا ان کا داؤں برباد نہ کر ڈالا اور ان پر پرندوں کے جھنڈ بھیجے جنھوں نے انھیں سنگریزوں سے مار مار کر چبائے ہوئے بھس کی طرح کر ڈالا۔

واقعہ فیل اتنا مشہور و معروف ہے کہ اس کی صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے ایک طرف پورے ملک پر کعبہ کی عظمت و جلال کا سکہ بٹھا دیا تو دوسری طرف حضرت عبدالمطلب کے عزو جاہ میں چار چاند لگا دیئے۔

بروایت راجح ولادت پاک سے پچپن دن پہلے سترہ محرم کو یہ عبرتناک واقعہ پیش آیا۔ بعض روایتوں میں ہفتہ کا دن آیا ہے مگر یہ کسی طرح درست نہیں جب کہ ولادت ۱۲ ربیع الاول دوشنبہ کو ہوئی ہے تو پچپن دن پہلے ۱۷ محرم کو بدھ کا دن پڑتا ہے جو اس قسم کے سرکشوں کی سرکوبی کیلئے پہلے ہی سے متعین ہو چکا ہے۔

حضرت امام باقر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعۂ فیل پندرہ محرم کو ہوا۔ پندرہ اور سترہ کے قول میں یہ تطبیق ہو سکتی ہے کہ ابرہہ مغمس میں پندرہ کو آیا۔ اور سترہ کو کعبہ کی طرف بڑھا جس نے اس کی آمد کو اہم سمجھا پندرہ کہا اور جس نے اس کے حملہ کو اس کے حملے کی تاریخ یاد رکھی۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ مبنی ہو تاریخِ ولادت کے اختلاف پر مذہب مشہور ۱۲ ربیع الاول ہے۔ اور مذہب مختار دس ربیع الاول ہو سکتا ہے حضرت امام باقر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول مذہب مختار کی بنا پر ہو۔ وَاللہُ تعالیٰ اعلم

دیگر خوارق عادات

جس رات نورِ مصطفےٰ بطن آمنہ میں مستقر ہوا۔ اللہ عزوجل نے رضوان خازن جنت کو حکم دیا۔ فردوس کے دروازے کھول دیئے جائیں۔ ایک منادی نے تمام آسمان و زمین میں ندا کی آج نور نبوی بطن مادر میں تشریف فرما ہو گیا آمنہ کو مبارکباد۔ اس دن روئے زمین کے تمام بت اوندھے ہو کر گر پڑے تمام چوپایوں کو خصوصاً قریش کے جانوروں کو گویائی عطا ہوئی۔ انھوں نے بزبان فصیح یہ کہا آج اللہ کے رسول سے ان کی والدہ حاملہ ہوئیں۔ رب کعبہ کی قسم وہ تمام دنیا کے امام اور چراغ ہیں۔ وحوشِ مشرق نے وحوشِ مغرب کو خوش خبری دی۔ قریش سخت قحط اور تنگی میں تھے۔ درخت سوکھ گئے تھے۔ جانور دبلے ہو گئے تھے۔ اللہ عزوجل نے رحمتِ عالم کے ورود مسعود کی تقریب

میں موسلا دھار بارش برسائی۔ جس سے وادیاں بھر گئیں۔ نالے بہنکلے۔ درخت سرسبز شاداب ہو گئے۔ جانور فربہ تنومند ہو گئے۔ اسی خیر و برکت کی بنا پر اہل عرب نے اس سال کا نام سنۃ الفرح والابتہاج رکھا

حضرت آمنہ فرماتی ہیں کہ ایام حمل میں حاملہ کو جن تکلیف دہ باتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے ان میں سے کوئی بھی مجھے نہ ہوئی، مجھے یہ بھی پتہ نہ چلا کہ میں حاملہ ہوں۔ سوائے اس کے کہ میرے ایام بند ہو گئے۔

بعض روایتوں میں ہے کہ شدید ترین بوجھ محسوس ہوا۔ امام ابونعیم وغیرہ نے یہ تطبیق دی کہ ابتدائے حمل میں بوجھ معلوم ہوا بعد میں بالکل نہیں یہ بھی خرق عادت ہے۔ نیز فرماتی ہیں ان دنوں میں نے عالم واقعہ میں دیکھا کہ میرے جسم سے ایک نور نکل کر تمام عالم میں پھیل گیا۔ اسی کی روشنی میں، میں نے بُصریٰ کے محل دیکھے۔ اور فرماتی ہیں کہ چھ ماہ پورے ہونے پر خواب میں یہ ندا سنی۔ اے آمنہ تیرے بطن میں عالم کا افضل ترین فرد ہے۔ جب یہ دنیا میں تشریف لائیں تو ان کا نام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) رکھنا۔ یہ بات صیغۂ راز میں رہے۔

خورشیدِ رسالت کا طلوع

آج بہار خلد وادی تہامہ میں اتر آئی ہے۔ آسمان اپنی انجمن کے ساتھ دولت سرائے آمنہ پر جھکا ہوا ہے۔ ماہتاب وسط آسمان پر کھڑا، فضائے بسیط پر اپنی نقرئی چاندنی تانے ہوئے ہے۔ آفتاب بڑی تیزی سے افقِ مکہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ جبرئیل امین ملأ اعلیٰ کے نورانی انفاس کی فوج در فوج جلو میں لے کر دست بستہ کاشانۂ عبداللہ پر کھڑے ہیں۔ کارکنان قضا وقدر چشم براہ۔ ملکۂ مصر آسیہ، کنواری بتول مریم حورانِ بہشت کے ساتھ خلوت کدۂ آمنہ میں حاضر ہوئیں

کیوں ؟ اس لئے کہ

نورِ ازل کا آئینۂ جمال وکمال۔ قادرِ کل کا مظہرِ ذات وصفات۔ رب العلمین کا خلیفہ اعظم، خالق کونین کا نائبِ اکبر۔ خزائن السموٰت والارض کا مالک۔ نِعَمِ ہائے الٰہیہ کا قاسم۔ ملکوت وملک کا تاجدار، بحر وبر کا مختار، سید المرسلین، خاتم النبیین، رحمۃ للعلمین، شفیع المذنبین، دعائے خلیل، تمنائے کلیم، بشارتِ مسیح۔ جگر گوشۂ عبداللہ، نور دیدۂ آمنہ رونق افزائے عالمِ شہود ہونے والا ہے

ولادت

حضرت آمنہ فرماتی ہیں۔ قرب ولادت جب مجھے درد شروع ہوا تو میں گھر میں تنہا تھی۔ ایک خوفناک آواز آئی جس سے میں لرز اٹھی۔ پھر ایک مرغ سفید نے میرے دل پر بازو ملا جس سے خوف اور درد جاتا رہا۔ اس کے

بعد غیب سے ایک پیالہ نمودار ہوا جس میں نہایت شیریں شربت تھا، میں نے اسے پی لیا جس سے مکمل سکون حاصل ہوگیا۔ پھر کچھ عورتیں غیب سے نمودار ہوئیں جو بناتِ عبد مناف کی طرح دراز قد تھیں۔ مجھے تعجب ہوا یہ کہاں سے آگئیں۔ وہ خود بولیں ہم ——— آسیہ زوجۂ فرعون اور مریم بنتِ عمران ہیں۔ ہمارے ساتھ یہ حورانِ خلد آپ کی خدمت کی سعادت حاصل کرنے کے لئے آئی ہیں۔ فرماتی ہیں میرا حال سخت نازک تھا۔ لمحہ بہ لمحہ عجیب عجیب خوفناک سے خوفناک آوازیں آتی رہتی تھیں۔ اسی اثنا میں دیبائے سفید کے پردے آسمان و زمین کے مابین تان دیئے گئے۔ اور کچھ لوگ نقرئی چھاگل (لوٹا) لئے آسمان و زمین کے درمیان کھڑے ہو گئے۔ پرندوں کے ایک جھنڈ نے میرے گھر کو گھیر لیا۔ جن کے منقار زمرد کے اور بازو یاقوت کے تھے۔ اللہ عزوجل نے غیب کے پردے اٹھا دیئے، میں نے تمام روئے زمین کو دیکھ لیا میں نے تین علم سبز نصب کئے ہوئے دیکھے۔ ایک کعبہ کی چھت پر ایک مغرب میں ایک مشرق میں۔ میں عالم غیب کے ان محیر العقول گوناگوں کرشموں کے نظارہ میں محو تھی کہ محبوبِ رب العلمین اس خاک دانِ گیتی میں تشریف لائے۔ رَبِّ صَلِّ علیہ افضلُ الصلوات بقدر فضلہ وسلم علیہ احسن التسلیمات بقدر حسنہ وعلیٰ الہ وصحبہ دائماً ابداً۔

زمین پر قدم رکھتے ہی سجدہ میں سر رکھ کر کلمہ کی دونوں انگلیاں آسمان کی طرف اٹھا کر اپنے رب کے ساتھ راز و نیاز میں مشغول ہو گئے۔ جسم اقدس ہر قسم کی گندگیوں سے پاک تھا۔ ناف بُریدہ اور مختون تھے۔

ایک ابر کا ٹکڑا آیا انھیں لے کر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ ایک آواز آئی ان کو عالم کے تمام خشک و تر کی سیر کراؤ۔ سب سے ان کا تعارف کراؤ۔ حلیہ دکھاؤ۔ نام بتاؤ۔ ان کا نام ماحی ہے۔ یہ شرک مٹانے والے ہیں۔ دوسری روایت مفصلاً یوں ہے کہ بعد ولادت ابر کا بہت بڑا چمکدار ٹکڑا نمودار

ہوا۔ اس میں سے گھوڑوں کے بازوؤں کی سرسراہٹ، بات چیت کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یہ ابر آنحضور کو میری گود سے لے کر غائب ہوگیا۔ پھر میں نے سنا کوئی کہہ رہا ہے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو تمام زمین میں پھراؤ۔ تمام ارواح جن وانس ملائکہ وحوش وطیور کو پہچنواؤ۔ اور انہیں خلق آدم، معرفت شیث۔ شجاعت نوح۔ خلت ابراہیم۔ لسان اسمٰعیل۔ رضائے اسحٰق۔ فصاحت صالح۔ حکمت لوط۔ بشریٰ یعقوب۔ شدت موسیٰ۔ صبر ایوب۔ طاعت یونس۔ جہاد یوشع۔ صوت داؤد۔ حب دانیال۔ وقار الیاس۔ عصمت یحییٰ۔ زہد عیسیٰ عطا کر کے تمام پیغمبروں کے اخلاق سے مزین کر دو۔ اس کے بعد بادل چھٹ گیا۔ میں نے دیکھا کہ آپ سبز ریشمین کپڑے میں لپٹے ہوئے ہیں۔ اس کپڑے سے پانی ٹپک رہا ہے۔ آواز آئی کیا خوب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو تمام دنیا پر قبضہ دے دیا گیا دنیا کی کوئی مخلوق باقی نہ رہی جو ان کے قبضۂ اقتدار وحیطۂ طاعت میں نہ ہو۔ اب میں نے چہرۂ انور کو دیکھا ماہِ تمام کی طرح تاباں تھا اور جسم اقدس سے مشک اذفر کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔

پھر تین شخص نظر آئے۔ ایک کے ہاتھ میں چاندی کا چھاگل تھا۔ دوسرے کے ہاتھ زمرد سبز کا طشت۔ تیسرے کے ہاتھ میں ایک چمکدار انگوٹھی تھی جس سے آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ انگوٹھی کو سات بار دھو کر حضور سید عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دونوں شانوں کے درمیان مہر نبوت لگا دی۔ پھر حضور کو ریشمین کپڑے میں لپیٹ کر اٹھایا اور تھوڑی دیر کے بعد مجھے سپرد کر دیا۔

حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی والدہ شفا سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتی ہیں کہ وقت ولادت میں حاضر تھی۔ یہ سعادت مجھی کو نصیب ہوئی کہ اس عالم میں تشریف لانے کے بعد سب سے پہلے میں نے ہی آنحضور کو اپنے ہاتھوں میں لیا۔ آنحضور کے دہن اقدس سے

کوئی آواز نکلی۔ غیب سے کسی نے جواب دیا۔ یَرْحَمُكَ اللّٰہُ۔

فرماتی ہیں۔ آنحضور کے تشریف لاتے ہی عظیم نور پھیلا جس سے شرق وغرب روشن ہوگیا۔ حتیٰ کہ میں نے اس کی روشنی میں شام کے محل دیکھ لئے۔ مجھ پر عجیب قسم کا خوف طاری ہوا جس کے اثر سے میں کانپنے لگی۔ پھر ایک نور داہنی طرف سے پیدا ہوا۔ اور کسی نے کہا انھیں کہاں لے گئے تھے۔ کسی اور نے جواب دیا۔ انھیں مغرب کی جانب لے گیا تھا اور تمام مقاماتِ متبرکہ کی سیر کرالایا۔ پھر بائیں جانب سے ایک نور پیدا ہوا۔ اس میں سے بھی کسی نے پوچھا کہاں لے گئے تھے۔ کسی نے جواب میں کہا انھیں مشرق کی جانب لے گیا تھا اور تمام مقاماتِ متبرکہ کی سیر کرالایا۔ انھیں حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی خدمت میں بھی پیش کیا۔ اور انھوں نے اپنے لختِ جگر کو سینہ سے لگایا اور طہارت وبرکت کی دعا دی۔

عثمان بن العاص کی والدہ فرماتی ہیں میں اس وقت موجود تھی۔ میں نے دیکھا کہ تمام گھر انوار سے درخشاں ہے اور ستارے جھکے آرہے ہیں معلوم ہوتا ہے زمین پر ٹوٹ پڑیں گے۔

حضرت عبدالمطلب فرماتے ہیں کہ میں شب ولادت کعبہ کے قریب تھا۔ آدھی رات کے بعد میں نے دیکھا۔ کعبہ نے مقام ابراہیم کی جانب سجدہ کیا اور یہ تکبیر پڑھی۔

اللہ اکبر اللہ اکبر رب محمد المصطفیٰ الان قد طھرنی ربی من انجاس الاصنام وارجاس المشرکین	اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے اللہ محمد مصطفیٰ کا پروردگار ہے۔ اب مجھے میرے پروردگار نے بتوں کی نجاست اور مشرکین کی گندگی سے پاک کیا۔

غیب سے ایک آواز آئی۔ رب کعبہ کی قسم۔ سب لوگ سن لو۔ حق تعالیٰ نے کعبہ کو برگزیدہ کرلیا۔ اور آنے والے شہنشاہ رسالت کا کعبہ کو قبلہ

اور مسکن بنایا۔ کعبہ کے ارد گرد جتنے بت تھے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ اور سب سے بڑا بت ہبل منہ کے بل اوندھا گر پڑا۔ ایک ندا آئی۔ آمنہ کے بطن مبارک سے محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، عالمِ امکان میں رحمت کے دل بادل لئے جلوہ فرما ہو گئے۔

عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ۔ مر الظہران[1] میں عیص نام کا ایک راہب رہتا تھا۔ آنحضور کی ولادت کے قریب وہ اکثر کہا کرتا تھا۔ اہلِ مکہ تم میں ایک لڑکا پیدا ہونے والا ہے۔ جس کی تمام عرب اطاعت کریں گے۔ اور وہ عجم کا بھی مالک ہو گا۔

مکہ میں جو بھی لڑکا پیدا ہوتا۔ اس کے حالات دریافت کرتا۔ جب آنحضور کی ولادت ہوئی۔ حضرت عبد المطلب نے صبح کو اسے اطلاع دی۔ اس نے پوچھا نام کیا رکھا ہے۔ عبد المطلب نے بتایا "محمد"۔ اس نے کہا کہ یہ وہی لڑکا ہے۔ میں جس کا تذکرہ کیا کرتا تھا۔ میں انھیں تین نشانیوں سے پہچانتا ہوں۔

ایک۔ ان کے طالع سے جو کل طلوع ہوا۔

دوسرے یہ کہ ان کی ولادت دوشنبہ کو ہو گی۔

تیسرے ان کے نام سے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ ایک یہودی کا ہے۔ جو بسلسلہ تجارت مکہ میں رہتا تھا۔ شبِ ولادت اس نے پوچھا۔ اے قریش تم میں کوئی لڑکا پیدا ہوا ہے۔ جس سے پوچھا تھا اس نے لاعلمی ظاہر کی۔ اس یہودی نے بتایا آج ایک لڑکا پیدا ہوا ہے جو خاتم النبیین ہے۔ اسکے دونوں شانوں کے درمیان مہرِ نبوت ہو گی۔ تفتیش کرنے پر آنحضور کی ولادت کا پتہ چلا۔ یہودی کو حضرت آمنہ کے پاس لے گئے۔ یہودی آنحضور کی پشت

---

[1] مکہ کے قریب وادیٔ فاطمہ میں ایک گاؤں ہے ۱۲ (مجیب اشرف)

مبارک پر مہر نبوت دیکھتے ہی بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ ہوش میں آنے کے بعد بولا۔ اب بنی اسرائیل سے نبوت گئی۔

یوں ہی حضرت حسان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ میں وقت ولادت باسعادت سات آٹھ سال کا تھا، ایک دن صبح کے وقت ایک یہودی کو چیختے چلاتے دیکھا لوگوں نے پوچھا تجھ پر کیا مصیبت نازل ہوئی ہے وہ بولا۔ آج طالع احمد ظاہر ہو گیا۔ وہ آج پیدا ہو گئے۔

شہنشاہ کونین کی آمد آمد پر جو عظیم انقلابات رونما ہوئے ان میں سے چند یہ ہیں۔

۱ــــــ آتشکدہ فارس، جسے گستاشپ نے زردشت کی تحریک پر مجوسیت اختیار کرنے کے بعد ہزار سال پہلے قائم کیا تھا۔ اور اس وقت سے لے کر اب تک کبھی بجھا نہ تھا ــــــ دفعۃً سرد ہو گیا۔

۲ــــــ بحیرۂ ساوا کا تمام پانی زیر زمین تہ نشین ہو گیا اور وہ بالکل سوکھ گیا۔

۳ــــــ وادی سماوا جو پہلے دریا تھا ہزار سال سے خشک پڑا تھا یک بیک بہ نکلا۔

۴ــــــ کسریٰ شاہ ایران کے محل میں زبردست زلزلہ آیا جس کے جھٹکے سے اس کے چودہ کنگرے ٹوٹ کر گر پڑے۔

یہ زمانہ نوشیرواں کا تھا اس نے کثیر دولت صرف کر کے یہ دنیا کا مشہور و معروف محل بنوایا تھا۔ اتنا پائدار تھا کہ ہارون الرشید نے اس کے دفینے حاصل کرنے کے لئے ڈھوا کر کھودنا چاہا کام شروع کرا دیا مگر کامیاب نہ ہو سکا زلزلے اور کنگروں کے ٹوٹنے سے نوشیرواں کے دل میں خوف و ہراس پیدا ہوا لیکن اپنے کو قابو میں رکھ کر اس کو چھپائے رکھا۔ کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا۔

اس کی مملکت کے چیف جسٹس موبان نے خواب دیکھا، چند تیز وطرار اونٹ عربی گھوڑوں کو کھینچتے ہوئے آئے ہیں اور دجلہ پار کر کے بلاد فارس میں پھیل گئے ہیں۔ اس کی تعبیر خود اس کے ذہن میں یہ آئی کہ عرب میں کوئی ایسی نئی بات پیدا ہوئی ہے جس سے اہلِ عجم مغلوب ہوں گے۔

نوشیرواں نے کاہنوں کے پاس ان احوال کی تحقیق کے لئے آدمی دوڑائے۔ اس زمانہ میں سُطَیح نامی ایک عجیب الخلقت کاہن تھا۔ اس کے بدن میں کہیں جوڑ نہ تھا۔ اور نہ کھوپڑی اور نہ انگلیوں کے ماسوا کہیں ہڈی تھی۔ سر گردن میں کوئی امتیاز نہ تھا۔ سینہ میں منہ تھا۔ اسے کہیں لے جانا ہوتا تو کپڑے میں لپیٹ کر گٹھری باندھ کر لادلیتے اور جہاں چاہتے لے جاتے۔ خود ہل جل نہیں سکتا تھا۔ جب کچھ پوچھنا ہوتا تو دہی کے مشک کی طرح ہلاتے جس سے اس کے بدن میں قوت آتی اور وہ سوالات کے جوابات دیتا اس کی عمر تقریباً چھ سو سال تھی۔ علمِ کہانت میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ تمام کاہنوں کا سربراہ تھا۔

نوشیرواں کے آدمی جب سُطَیح کے پاس پہنچے تو وہ عالم نزع میں تھا نوشیرواں کے آدمیوں نے اس کو سلام کرنے کے بعد نوشیرواں کا سلام پہنچایا لیکن سطیح نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نوشیرواں کے قاصد نے کچھ اشعار پڑھے جن میں کسریٰ کا سوال مذکور تھا۔ سطیح ان اشعار کو سن کر ہنسا اور بولا۔

جس وقت قرآن کی تلاوت ہونے لگے۔ اور صاحب عصا ظاہر ہو جائیں اور وادی سماوا بہنے لگے۔ دریائے ساوہ خشک ہو جائے۔ آتشکدہ فارس بجھ جائے اور سطیح مرجائے، سطیح اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ اس کی روح نکل گئی۔

۵ ——— تمام عالم کے بت اس رات اوندھے منہ گر پڑے۔ حضرت عبدالمطلب کا چشم دید واقعہ اوپر گزرا۔ قریش اپنے بت کے تھان پر سالانہ میلا لگاتے تھے۔ اتفاق سے یہ ایام میلے کے تھے۔ قریش نے اس رات

دیکھا کہ یہ بت اپنی جگہ سے گر پڑا۔ جلدی سے دوڑے گئے اور اسے اٹھا کر سیدھا کھڑا کر دیا۔ لیکن پھر گر پڑا۔ دوبارہ اٹھایا رکھا مگر پھر گر پڑا لیکن قریش نے پھر تیسری مرتبہ اس کو بڑی مضبوطی کے ساتھ اس کی جگہ نصب کیا اب اس کے جوف سے آواز آئی۔

تردّی بمولود اضاءت بنورہ جمیع فجاج الارض بالشرق والغرب

ہلاک ہو گئے اس مولود کی پیدائش سے جسکے نور سے شرق وغرب کی تمام گلیاں چمک اٹھیں

وخرت لہ الاوثان طرا وارعدت قلوب ملوک الارض من الرعب

اور تمام بت گر پڑے اور اسکی ہیبت سے، روئے زمین کے تمام بادشاہوں کے دل لرز اٹھے

تاریخ ولادت

تاریخ ولادت کے بارے میں کئی اختلاف ہیں۔ کون مہینہ تھا۔ اس میں چھ قول ہیں۔ ربیع الاول۔ ربیع الآخر۔ رجب۔ رمضان۔ محرم۔ صفر۔ اسی طرح جو لوگ ربیع الاول کو ماہ ولادت مانتے ہیں ان میں تاریخ کے بارے میں شدید اختلاف ہے۔ سات اقوال ہیں۔ دو۔ آٹھ۔ دس۔ بارہ۔ سترہ۔ اٹھارہ۔ بائیس۔ رات کا وقت تھا یا دن کا۔ جگہ کون سی تھی۔

صدیوں کی بحث وتمحیص کے بعد یہ طے ہو چکا ہے کہ مہینہ ربیع الاول کا تھا۔ وقت صبح صادق کا اور جگہ مکہ معظمہ اس جگہ جہاں چند سال پہلے تک مولد پاک کی عمارت موجود تھی۔ جسے ڈھا کر نجدی حکومت نے برابر کر دیا ہے۔ دن کے بارے میں البتہ کوئی اختلاف نہیں۔ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ دوشنبہ کا دن تھا۔ لیکن تاریخ کا مسئلہ جتنا پہلے پیچیدہ تھا اتنا ہی آج بھی ہے۔ جمہور اس کے قائل ہیں کہ ۱۲ ربیع الاول ہے۔ حتیٰ کہ ابن جوزی وغیرہ نے اس پر اجماع کا دعویٰ بھی کیا ہے۔ علامہ زرقانی شرح مواہب میں فرماتے ہیں۔

والمشهور انه صلی اللہ علیہ وسلم ولد یوم الاثنین ثانی عشر ربیع الاول وھو قول محمد بن اسحٰق بن یسار امام المغازی وقول غیرہ قال ابن کثیر وھو المشھور عند الجمھور وبالغ ابن الجوزی وابن الجزار فنقلا فیہ الاجماع وھو الذی علیہ العمل

مشہور یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم دوشنبہ کے دن بارہ ربیع الاول کو پیدا ہوئے یہی امام مغازی ابن اسحٰق وغیرہ کا قول ہے۔ ابن کثیر نے کہا جمہور کے نزدیک یہی مشہور ہے۔ ابن جوزی و ابن جزار نے اس میں مبالغہ کیا اور اجماع نقل کر ڈالا۔ اسی پر عمل ہے۔

لیکن علم ہیئت کے ماہرین کا اس پر اجماع ہے کہ آٹھ ربیع الاول کو ولادت ہوئی۔ اسی میں ہے۔

وقیل لثمان خلت منہ واختارہ الحمیدی وشیخہ ابن حزم وحکی القضاعی فی عیون المعارف اجماع اھل الزیج علیہ۔

اور ایک قول یہ ہے کہ آٹھ ربیع الاول کو ولادت ہوئی اسے حمیدی اور اس کے استاذ ابن حزم نے اختیار کیا۔ قضاعی نے عیون المعارف میں اہل زیج (توقیت) کا اس پر اجماع نقل کیا۔

لیکن سیرۃ النبی وغیرہ میں تاریخ ولادت ۹ ربیع الاول تحریر ہے۔ اور یہ مصر کے مشہور ہیئت داں محمود پاشا فلکی کی تقلید ہے۔ محمود پاشا فلکی نے ایک رسالہ نتائج الافہام لکھا ہے اس میں بڑی عرق ریزی سے یہ ثابت کیا ہے کہ صحیح تاریخ ولادت ۹ ربیع الاول ہے۔ اسی کا اقتباس حاشیہ سیرۃ النبی میں یہ ہے۔

"صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابراہیم (شہزادہ سرکار رسالت) کے انتقال کے وقت آفتاب میں گہن لگا تھا۔ اور دس ہجری تھا اور اس وقت آپ کی عمر کا تریسٹھواں سال تھا۔ ریاضی کے قاعدے سے حساب لگانے سے معلوم ہوتا ہے کہ دس ہجری کا گرہن ۷ جنوری ۶۳۲ء کو آٹھ بجکے تیس منٹ

پر لگا تھا۔ اس حساب سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر قمری ترسٹھ برس پیچھے ہٹیں تو آپ کی پیدائش کا سال ۵۷۱ء ہے۔ جس میں از روئے قواعد رویت ربیع الاول کی پہلی تاریخ ۱۲ اپریل کے مطابق ہے۔ تاریخ ولادت میں اختلاف ہے لیکن اس قدر متفق علیہ ہے کہ وہ ربیع الاول کا مہینہ دوشنبہ کا دن تھا۔ تاریخ آٹھ سے لے کر بارہ تک میں منحصر ہے۔ ربیع الاول مذکور کی ان تاریخوں میں دوشنبہ کا دن نویں تاریخ کو پڑتا ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر تاریخ ولادت قطعاً ۲۰ اپریل ۵۷۱ء تھی۔

سیرت کی دوسری اردو کتاب رحمۃ للعلمین میں بھی اسی کو اختیار کیا اس میں ہے۔

تاریخ ولادت میں مورخین نے اختلاف کیا ہے۔ طبری و ابن خلدون نے ۱۲ تاریخ، ابوالفدا نے دس لکھی ہے مگر سب کا اتفاق ہے کہ دوشنبہ کا دن ۹ ربیع الاول کے سوا کسی اور تاریخ سے مطابقت نہیں کھاتا اس لئے ۹ ربیع الاول ہی صحیح ہے۔ تاریخ دول العرب والاسلام میں محمد طلعت بک عرب نے بھی ۹ تاریخ ہی کو صحیح قرار دیا ہے۔ (صـ۴۲ ج ۲)

محمود پاشا فلکی کی تحقیق پر از روئے قواعد ہیئت کلام "کوہ کن کاہ برآوردن" سے کم نہیں۔ اس لئے اس پُر پیچ وادی سے ناظرین کو بچاتے ہوئے ہم چند عام فہم معروضات پیش کرتے ہیں۔

ا ــــــ اس میں دو رائیں نہیں کہ کسی واقعہ کو قیاس سے ثابت کرنا تاریخ نویسی نہیں افسانہ نگاری ہے۔ جب کہ اس واقعہ کے بارے میں تاریخی شہادتیں موجود ہوں۔ ہاں اگر روایات مختلف ہوں۔ تو کسی ایک روایت کو قیاس سے ترجیح دے سکتے ہیں۔ تاریخ ولادت کے بارے میں روایتیں موجود ہیں۔ ان روایتوں میں سے کسی ایک روایت کو ترجیح دینے کے لئے علم ہیئت کی شہادت پیش کی جا سکتی ہے۔ ان

روایتوں سے الگ کوئی تاریخ معین کرنی اگرچہ وہ علم ہیئت کی مدد سے ہو اصول سوانح نگاری کے بالکل خلاف ہے۔ کتب حدیث و سیر کا ایک ایک ورق پڑھ جائیے آپ کو ۹ تاریخ کی کوئی روایت کہیں نہیں ملے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ۹ کو ولادت مبارکہ نہ ہونے پر محدثین و ارباب سیر کا اجماع مؤلّف ہے۔ اس اجماع کے خلاف قواعدِ رویت کی مدد سے ۹ تاریخ متعین کرنی کسی طرح لائق قبول نہیں۔ خود علمار ہیئت اس پر متفق ہیں کہ علم فلکیات کے تمام قواعد تخمینی ہیں۔ روایات صحیحہ کے مقابلہ میں تخمین پر بھروسہ کرنا کبھی بھی دیانت داری نہیں کہی جاسکتی۔

۲ ــــــ پھر حساب کی غلطی بہت ممکن۔ ادنیٰ سی بھول چوک سے حساب کچھ کا کچھ ہوسکتا ہے۔ یہیں دیکھئے حاشیہ سیرۃ النبی میں حضرت ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یوم وفات ۷ر جنوری تحریر ہے۔ اور رحمۃ للعلمین میں ۲۷ر جنوری۔ ان میں کون صحیح ہے یہ کون بتائے؟

۳ ــــــ حضرت ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے یوم وصال قمری کون تاریخ تھی یہ حاشیہ سیرۃ النبی میں نہیں۔ مگر رحمۃ للعلمین میں ۲۹ر شوال اور دن دوشنبہ کا لکھا ہے۔ اور از روئے قواعد سورج گہن قمری مہینے کی تین آخری تاریخوں کے علاوہ اور کسی تاریخ میں لگ نہیں سکتا۔ ایک کی تحقیق کے مطابق سنہ ۱۰ھ کی ۲۹ر شوال کو ۷ر جنوری تھی۔ دوسرے کی تحقیق کے مطابق ۲۷ر جنوری۔ ان دونوں میں کون حساب درست ہے۔ یہ فیصلہ کیسے ہو؟

۴ ــــــ چلئے آپ کی خوشی سے ہم مان لیتے ہیں کہ ۵۷۱ء میں ربیع الاول کی ۹ تاریخ کو دوشنبہ تھا۔ تو جب ۹ کو دوشنبہ تھا تو دو کو بھی دوشنبہ ہوگا پھر دو کو چھوڑ کر ۹ کی ترجیح، ترجیح بلا مرجح ہی نہیں ترجیح معدوم ہے کیونکہ ابھی گزر چکا ۹ر کا کوئی قول نہیں۔ اور دو کے بارے میں روایت ہے تو ترجیح ہوگی تو دو کو نہ کہ ۹ر کو۔ اور اگر بغیر روایت کے ۹ر کی ترجیح پر اصرار ہے تو

جیسے ۹ر ویسے ہی ۱۶ر ویسے ۲۳ر ویسے ہی ۳۰ر۔ پھر ۹ر کے اختیار کی وجہ؟
الغرض انھیں محققین کے تسلیم کردہ اصول کے مطابق ترجیح اگر ہوگی تو دو
کو۔ نو کی ترجیح کسی طرح ممکن نہیں۔

۵ ـــــ اس تحقیق میں بنیادی غلطی یہ ہے کہ ان لوگوں نے روایتوں
کو پس پشت ڈال کر اپنے جی سے مختلف فیہ باتوں کو متفق علیہ بنا کر ۹ کو اختیار
کرلیا ہے۔ مثلاً محشی سیرۃ النبی لکھتے ہیں۔

تاریخ ولادت میں اختلاف ہے۔ لیکن اس قدر متفق علیہ ہے کہ وہ
ربیع الاول کا مہینہ اور دوشنبہ کا دن تھا اور تاریخ آٹھ سے لے کر بارہ تک
میں منحصر ہے۔

رحمۃ للعلمین میں ہے۔

تاریخ ولادت میں مورخین نے اختلاف کیا۔ طبری و ابن خلدون نے
۱۲ر تاریخ ـــ ابوالفدا نے دس لکھی۔ مگر سب کا اتفاق ہے کہ دوشنبہ
کا دن ۹ر ربیع الاول کے سوا کسی اور تاریخ سے مطابقت نہیں رکھتا۔

ان لوگوں نے جن جن باتوں کو متفقہ بتایا ہے۔ ان میں سوائے اسکے
کہ دوشنبہ کا دن تھا۔ اور کوئی بات متفق علیہ نہیں۔ نہ مہینہ نہ تاریخ کا ۸ر سے
لے کر بارہ میں منحصر ہونا نہ دوشنبہ کے دن کا صرف ۹ر ربیع الاول کے ساتھ
مطابق ہونا۔ مہینے کے بارے میں چونکہ راجح مختار یہی ہے کہ ربیع الاول ہے
اس لئے ہم اس سے قطع نظر کرتے ہیں۔ بقیہ باتوں کے بارے میں طول طویل
شہادتوں کے بجائے زرقانی علی المواہب کی یہ جامع عبارت پیش کرتے ہیں

فقیل انہ ولد للیلتین خلتا من ربیع الاول بہ قال صدر مغلطائی وقیل لثمان خلت منہ قال الشیخ قطب الدین القسطلانی وھو اختیار اکثر	ایک قول یہ ہے کہ تاریخ ولادت دو ربیع الاول ہے۔ یہ صدر مغلطائی کا قول ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ آٹھ ہے شیخ قطب الدین قسطلانی نے فرمایا یہی اکثر

اهل الحدیث ونقل عن ابن عباس وجبیر بن مطعم وھواختیار اکثر من له معرفة بھذا الشان یعنی التاریخ واختارہ الحمیدی و شیخه ابن حزم وحکی القضاعی فی عیون المعارف اجماع اھل الزیج علیه ورواہ الزھری عن محمد بن جبیر بن مطعم وکان عارفا بالنسب وایام العرب وقیل ولد لاثنی عشر من ربیع الاول وعلیه عمل اھل مکة قدیما وحدیثا فی زیارة مولدہ فی ھذا الوقت وقیل لسبع عشرة وقیل لثمان عشرة وقیل لثمان بقین وقیل ان ھذین القولین الاخرین غیر صحیحین عمن حکیا عنه بالکلیة والمشھور انه صلی اللہ تعالٰی علیه وسلم ولد یوم الاثنین ثانی عشر ربیع الاول وھو قول محمد بن اسحٰق امام المغازی وقول غیرہ قال ابن کثیر وھو المشھور عند الجمھور وبالغ ابن الجوزی وابن الجزار فنقلا الاجماع وھو الذی علیه العمل.

محدثین کا مختار، اور ابن عباس وجبیر بن مطعم سے منقول ہے۔ اکثر ماہرین تاریخ اور حمیدی اس کے استاذ ابن حزم کا بھی مختار ہے۔ قضاعی نے عیون المعارف میں اہل ہیئت کا اس پر اجماع بتایا۔ ابن شہاب زہری نے محمد بن جبیر بن مطعم سے اسے روایت کیا جو انساب اور عرب کی تاریخ کے ماہر تھے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ ۱۲ ہے۔ اسی پر اہل مکہ کا ہمیشہ سے عمل ہے کہ مکان[1] ولادت کی زیارت اسی تاریخ میں کرتے ہیں۔ ایک قول سترہ کا ہے اور ایک اٹھارہ کا اور ایک بائیس کا۔ اخیر کے دونوں جس کی طرف منسوب ہے اس سے بروایت صحیح ثابت نہیں۔ اور مشہور ۱۲ ربیع الاول دوشنبہ کا دن ہے۔ یہی ابن اسحٰق امام مغازی وغیرہ کا قول ہے ابن کثیر نے کہا یہی جمہور کے نزدیک مشہور ہے۔ ابن جوزی اور ابن جزار نے اس پر بہت مبالغہ کیا اور اجماع نقل کر ڈالا۔ عمل اسی پر ہے۔

---

[1] اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء اولیاء کے مکان مولد کی زیارت جائز ہے۔ اس حکم میں مدفن بھی ہے۔ مجیب اشرف

دمیاطی اور ابوالفدا نے دس ربیع الاول اختیار کیا۔ ان میں اٹھارہ بائیس کا قول ساقط الاعتبار ہے۔ باقی پانچ اقوال بچے۔ جب تاریخ کے بارے میں اتنے اقوال ہیں تو یہ کہنا کیسے صحیح ہے کہ تاریخ آٹھ سے لے کر بارہ تک میں منحصر ہے۔ یا صرف بارہ یا دس ہے۔

اسی طرح یہ بھی متفق علیہ نہیں کہ سنہ ولادت کے ربیع الاول میں دوشنبہ کا دن سوائے نو کے کسی اور تاریخ سے مطابقت نہیں رکھتا۔ ابھی گزرا کہ تمام اہل ہیئت کا اس پر اتفاق ہے کہ اس سال آٹھ ربیع الاول کو دوشنبہ تھا۔ نیز بر سبیل صدق جس طرح دوشنبہ کا دن نو کو پڑے گا۔ اسی طرح دو۔ سولہ تیئیس تیس کو بھی پڑے گا۔ پھر نو کی ترجیح کس بنا پر۔ اور اگر اسے درست مان لیا جائے تو ترجیح دو کو ہونی چاہئے۔ کیونکہ دو کی روایت ہے۔ ۹ کی کوئی روایت نہیں۔ مختصر یہ کہ ۹ ربیع الاول کا قول روایۃً درایۃً کسی طرح اس لائق بھی نہیں کہ اسے ذکر کیا جائے چہ جائیکہ اسے محقق و مختار بتایا جائے۔

صحیح تاریخ

ابھی گزرا کہ ان سات اقوال میں پانچ لائق غور ہیں۔ ان میں آٹھ ربیع الاول کا قول بحیثیت روایت اور درایت ہر طرح راجح و مختار ہے۔ بحیثیت روایت یوں کہ یہ سید المفسرین سیدنا وابن سیدنا حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ تعالیٰ عنہم جیسے اجلہ صحابہ کا قول ہے۔ ابن شہاب زہری اور محمد بن جبیر بن مطعم جیسے اکابر تابعین سے منقول ہے۔ یہی اکثر محدثین اور ماہرین تاریخ کا مختار ہے۔ اور بحیثیت درایت یوں کہ اس پر تمام اہل ہیئت کا اجماع ہے۔

لیکن چونکہ بارہ ربیع الاول کا قول عوام و خواص سب میں مشہور ہے اور جمہور اہل سیر کا مختار ہے۔ اسی پر تمام امت کا عمل ہے۔ اور تلقی امت بالقبول

کا شرع میں بہت اعتبار ہے۔ اس لئے جشن میلاد النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم منانے کے لئے ۱۲ ربیع الاول ہی مختار ہے۔ اس کے خلاف میں انتشار وافتراق ہے۔

اب ہم اس بحث کو امام اہلسنت مجدد اعظم اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان صاحب بریلوی قدس سرہ السامی کے کلمات طیبات پر تمام کرتے ہیں۔

اعلیٰ حضرت قدس سرہ جہاں دینیات میں یگانۂ وقت تھے وہیں ریاضی کے بھی امام تھے اس لئے تاریخ وتوقیت دونوں حیثیت سے آپ کے ارشادات قول فیصل ہیں۔ اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کا اس موضوع پر ایک رسالہ بھی ہے بدقسمتی سے وہ رسالہ نہیں مل سکا۔ جمادی الاولیٰ ۱۳۱۸ھ کا تحفہ حنفیہ کا شمارہ ملا۔ اس میں یہ جواہر پارے ملے جو ہدیہ ناظرین ہیں۔

سوال:۔ ولادت اقدس حضور پرنور سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تاریخ کیا ہے۔ بینوا توجروا

جواب:۔ دو۔ آٹھ۔ دس۔ بارہ۔ سترہ۔ اٹھارہ۔ بائیس۔ سات اقوال ہیں۔ مگر اشہر واکثر وماخوذ ومعتبر دوازدہم ربیع الاول شریف ہے۔ مکہ معظمہ میں ہمیشہ اسی تاریخ کو مکان مولد اقدس کی زیارت کرتے ہیں۔ کذا فی المواھب والمدارج۔ اور خاص اس مکان جنت نشان میں اسی تاریخ مجلس مقدس ہوتی ہے۔ کذا فی المدارج۔ علامہ قہستانی وفاضل زرقانی فرماتے ہیں۔

المشھور انہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ولد یوم الاثنین ثانی عشر ربیع الاول وھو قول محمد بن اسحٰق امام المغازی وغیرہ وعلیہ العمل۔

مشہور یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم دوشنبہ کے دن بارہ ربیع الاول کو پیدا ہوئے۔ یہی امام مغازی ابن اسحٰق وغیرہ کا قول ہے اور اسی پر عمل ہے۔

شرح مواہب میں امام ابن کثیر سے ہے المشھور عند الجمھور

اسی میں ہے ھوالذی علیہ العمل۔ شرح ہمزیہ میں ہے ھوالمشھور، علیہ العمل۔ اسی طرح مدارج وغیرہ میں تصریح کی۔

وان کان اکثر المحدثین والمورخین علی ثمان خلون وعلیہ اجمع اھل الزیجات واختارہ ابن حزم والحمیدی وروی عن ابن عباس وجبیر بن مطعم رضی اللہ تعالٰی عنھم وبالاول صدر مغلطائی واعتمدہ الذھبی فی تذھیب التھذیب تبعا للمزی فی التھذیب وحکی المشھور بقیل وصحح الدمیاطی عشرا خلت اقول وحاسبنا فوجدنا غرۃ المحرم الوسطیۃ عام ولادتہ صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم یوم الخمیس فکانت غرۃ شھر الولادۃ الکریمۃ الوسطیۃ یوم الاحد والھلالیۃ یوم الاثنین فکان یوم الاثنین الثامن من الشھر ولذا اجمع علیہ اصحاب الزیج وبمجرد ملاحظۃ الغرۃ الوسطیۃ یظھر استحالۃ سائر الاقوال ماخلا الطرفین والعلم بالحق عند مقلب الملوین۔

اگرچہ اکثر محدثین اور مورخین آٹھ تاریخ مانتے ہیں اور اسی پر اہل ہیئت کا اجماع ہے اور اسے ابن حزم اور حمیدی نے اختیار کیا۔ ابن عباس اور جبیر بن مطعم رضی اللہ تعالٰی عنہم سے مروی ہے۔ پہلا قول صدر مغلطائی کا ہے۔ اور اسی پر ذہبی نے تذہیب میں صاحب تہذیب مزی کی اتباع میں اعتماد کیا اور قول مشہور کو قیل سے نقل کیا۔ دمیاطی نے دس تاریخ کی تصحیح کی۔ "اقول ہیں نے حساب لگایا تو سن ولادت کے محرم کے غرہ وسطیہ کو پنجشنبہ کے دن پایا۔ تو ماہ ولادت مبارکہ کا غرہ وسطیہ یکشنبہ کو ہوا اور ہلالیہ دوشنبہ کو۔ پس دوشنبہ کو آٹھ ربیع الاول ہوئی۔ اسی وجہ سے اس پر اہل ہیئت نے اجماع کیا محض غرہ وسطیہ کے دیکھنے سے تمام اقوال کا محال ہونا ظاہر ہو جائے گا، علاوہ قول اول واخیر کے (یعنی دو اور بائیس کے) اور حقیقی علم شب و روز بدلنے والے کو ہے۔

اور شک نہیں کہ تلقی امت بالقبول کے لئے شان عظیم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

الفطر یوم یفطر الناس والاضحی یوم یضحی الناس۔ رواہ الترمذی عن ام المومنین عائشۃ الصدیقۃ بسند صحیح

عید الفطر اس دن ہے جس دن لوگ عید کریں اور عید الاضحیٰ اس روز ہے جس روز لوگ عید سمجھیں۔

اور فرماتے ہیں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔

فطرکم یوم تفطرون واضحاکم یوم یضحون (رواہ ابوداؤد والبیھقی فی السنن عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ بسند صحیح رواہ الترمذی) وحسنہ فزاد فی الصوم یوم تصومون والفطر یوم یفطرون وارسلہ الشافعی فی مسندہ و البیھقی فی سننہ عن عطاء فزاد فی اخرہ عرفۃ یوم تعرفون وان لم یصادف الواقع ونظیرہ التحری

مسلمانوں کا روزہ عید الفطر و عید الاضحیٰ اور عرفہ سب اس دن ہے۔ جس دن جمہور مسلمین خیال کریں۔ یعنی اگرچہ کسی وجہ۔ مثلاً رویت نہ ہونے کی وجہ سے) ________ اگرچہ واقع کے مطابق نہ ہوا اور اس کی نظیر تحری کا قبلہ ہونا ہے۔

لاجرم عیدِ میلادِ والا بھی کہ عید اکبر ہے قول و عمل جمہور مسلمین کے مطابق بہتر ہے۔

ولادت پاک باعتبار عیسوی ۲۰ اپریل ۵۷۱ء اور باعتبار بکرمی یکم جیٹھ سمت ۶۲۸ تھی۔ فارسی کا مہینہ نیسان تھا۔ اس کی تاریخ بھی ۲۰ تھی۔ آفتاب اس وقت برج حمل سے ۳۱ درجہ دقیقے پر تھا۔ اس دن صبح صادق کا طلوع افق مکہ معظمہ پر دھوپ گھڑی سے چار بجکر بیس منٹ پر اور عرب کے مروجہ حال ٹائم سے ۹ بجکر ۵۷ منٹ پر ہوا تھا۔ "غفر" منازل قمر میں تین چھوٹے چھوٹے ستارے ہیں۔ اس کے طلوع کے وقت ولادت ہوئی یہی تمام انبیاء کی ولادت کا وقت ہے۔

رضاعت

آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو سب سے پہلے ثویبہ، ابولہب کی باندی نے دودھ پلایا۔ ثویبہ ولادت پاک کی بشارت لے کر ابولہب کے پاس گئی اور بتایا کہ آپ کے مرحوم بھائی عبداللہ کے گھر ایک نونہال تشریف لائے ہیں، اس پر خوش ہو کر ابولہب نے ثویبہ کو آزاد کر دیا۔ اور حکم دیا کہ جاؤ انہیں دودھ پلاؤ۔ حدیث میں ہے کہ ولادت پاک کی مسرت میں باندی آزاد کرنے کے صلے میں عذاب شدید میں مبتلا ہونے کے باوجود ہر دوشنبہ کو ابولہب پر عذاب میں کچھ تخفیف ہو جاتی ہے اور کلمے کی انگلی اور انگوٹھے کی درمیانی گھاٹی سے پانی مل جاتا ہے۔ اسی موقع پر حضرت شیخ نے مدارج میں تحریر فرمایا ہے۔

دریں جا سند است اہل موالید را کہ در شب میلاد آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سرور کنند و بذل اموال نمایند۔ یعنی ابولہب کہ کافر بود و قرآن در مذمت وی نازل شدہ چوں بسرور میلاد آنحضرت و بذلِ شیر جاریہ وی بہ جہت آنحضرت جزا داده شد تا حال مسلمان کہ مملوست بہ محبت سرور و بذلِ مال در طریقِ وی چہ باشد۔ (صفحہ ۲۶ ج۔۲)

اس جگہ میلاد کرنیوالوں کے لئے سند ہے کہ یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شب ولادت میں خوشی مناتے ہیں مال خرچ کرتے ہیں مطلب یہ ہے کہ جب ابولہب کو جو کافر تھا اور قرآن اسکی مذمت میں نازل ہوا آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی پیدائش پر خوش ہونے اور باندی کا دودھ خرچ کرنے پر جزا دی گئی تو اس مسلمان کا کیا حال ہوگا جو آنحضرت صلی

اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی محبت میں سرشار
ہوکر خوشی منائے اور مال خرچ کرے۔

نہ صرف شیخ بلکہ کثیر علمائے اسلام مثل علامہ جزری، علامہ احمد خطیب قسطلانی علامہ محمد بن عبد الباقی رحمہم اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً نے یہ مضمون اپنی اپنی تصانیف میں تحریر کیا ہے۔

اسی ثویبہ نے سید الشہدا حضرت امیر حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی دودھ پلایا ہے۔ اسی رشتے سے حضرت حمزہ آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے رضاعی بھائی بھی ہوئے۔ ابن مندہ نے ثویبہ کو صحابیات میں شمار کیا ہے آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ مدینے سے کپڑے اور دوسری چیزیں بھیجا کرتے۔

ثویبہ کے علاوہ سات دن تک آپ کی والدہ ماجدہ نے دودھ پلایا پھر یہ سعادت حضرت حلیمہ کے نصیب میں آئی۔ اور مدتِ رضاعت تک آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت حلیمہ کا دودھ پیا۔ ان کے علاوہ اربابِ سِیَر نے اور بھی چند عورتوں کے نام گنائے ہیں جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دودھ پلانے کی سعادت حاصل کی۔ ام ایمن حضرت عبد اللہ کی باندی۔ ام فروہ۔ علاوہ حضرت حلیمہ کے اور ایک عورت انھیں کی ہم قبیلہ اور بنی سُلَیم کی تین کنواری عورتیں۔ استیعاب میں ہے کہ آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بنی سُلَیم کی تین کنواری عورتوں کے قریب گزرے۔ انھوں نے جوں ہی آپ کی پیار بھری طلعتِ زیبا دیکھی فرطِ محبت میں اپنا پستان دہانِ اقدس میں ڈال دیا۔ اور دودھ اتر آیا۔ بعض محدثین نے آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ارشادِ مبارک "انا ابن العواتك من بنی سُلَیم" کی یہی توجیہ کی ہے۔

اکثر اصحابِ سِیَر نے یہ لکھا ہے کہ سب سے پہلے آنحضور کو آپ کی والدہ نے دودھ پلایا۔ لیکن حضرت شیخ نے تحریر فرمایا کہ سب سے پہلے یہ شرف ثویبہ کو

ملا۔ فرماتے ہیں۔

اول کسیکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم راشیر داد ثویبہ بود کنیزک ابولہب۔

سب سے پہلے جس نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دودھ پلایا۔ ثویبہ ابولہب کی باندی تھی۔

درایتہً بھی یہی صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ عادۃً زچہ کو خصوصاً پہلی ولادت کے موقع پر دوسرے تیسرے دن دودھ اترتا ہے اور اس درمیان میں بچے کو کسی دوسری عورت کے دودھ کی حاجت ہوتی ہے اس لئے قرین قیاس یہی ہے کہ جب تک حضرت آمنہ کو دودھ نہ اترا ہو ثویبہ نے پلایا۔ پھر اس کے بعد حضرت آمنہ پلاتی رہیں۔

آنحضورؐ حلیمہؓ کی گود میں

دیہات کی آب و ہوا بہ نسبت شہروں کے صاف اور عمدہ ہوتی ہے۔ اس زمانے میں اہل بادیہ کی زبان بھی فصیح و بلیغ اور خالص ہوتی تھی شہر کی زبان میں مختلف بلاد کے لوگوں کی آمد و رفت کی وجہ سے خلط ملط ہو جاتا تھا اس لئے شرفاء عرب کا دستور تھا کہ بچوں کی پرورش بدوی قبائل میں کراتے تھے۔ چنانچہ بہت سے بدوی قبائل کا دستور تھا کہ وہ سال میں دو مرتبہ شہر میں آکر بچوں کو لے جاتے تھے۔ امسال بھی حسبِ دستور قبیلہ بنی سعد بن بکر کی کچھ عورتیں بچوں کے لئے مکہ آئیں جن میں حضرت حلیمہ بھی تھیں۔ یہ قبیلہ فصاحت و بلاغت میں اور ان کی بستی عمدگیِ آب و ہوا میں ممتاز تھی۔ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ میں تمام عرب سے زیادہ فصیح ہوں۔ کیونکہ میں قریشی ہوں۔ اور بنی سعد بن بکر میں پلا بڑھا ہوں۔

حضرت حلیمہ کی ساتھ والیوں کو ماں باپ والے مالدار بچے مل گئے۔ آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو یتیم ہونے کی وجہ سے کسی نے نہیں لیا۔ ادھر

مشیتِ ایزدی کہ حضرت حلیمہ کو بھی کوئی بچہ نہیں ملا۔ انہوں نے واپس آکر اپنے شوہر حارث سے مشورۃً پوچھا کہ خالی ہاتھ جانا بھی اچھا نہیں اگر تم رائے دو تو اس یتیم کو لے لوں۔

حارث نے اجازت دے دی یہ گئیں اور آنحضور کو لے آئیں۔ حضرت آمنہ نے جب دیکھا کہ دایہ بچے کے یتیم ہونے کی وجہ سے کچھ پژمردہ ہے تو دایہ کی تسلی کے لئے فرمایا۔

یاظئر سلی عن ابنک سیکون لہ شانا ۶ — اے دایہ اطمینان رکھ یہ بچہ بڑی شان والا ہوگا۔

برکات

حضرت حلیمہ فرماتی ہیں کہ جب آنحضور کو لینے کے لئے حاضر ہوئی تو دیکھا کہ آپ سبز ریشمین بچھونے پر سفید اونی کپڑے میں چت لیٹے ہوئے سو رہے ہیں۔ بینی مبارک سے پیاری پیاری آواز آرہی ہے۔ جمالِ پاک دیکھتے ہی وارفتہ ہوگئی۔ آہستگی سے قریب جاکر سینہ پر ہاتھ رکھا۔ آپ نے تبسم فرمایا اور آنکھیں کھول دیں میری طرف دیکھا۔ چشم مبارک سے ایک روشنی کی کرن نکل کر آسمان تک بلند ہوئی میں نے بڑھ کر پیشانی اقدس چوم لی گود میں لیا اور داہنا پستان منہ میں دیا۔ آپ نے اس کا دودھ پی لیا۔ پھر بایاں دیا مگر اسے منہ نہیں لگایا۔ اخیر رضاعت تک یہی حال تھا۔ ہمیشہ ایک پستان کا دودھ پیتے اور دوسرا میرے بچے کے لئے چھوڑ دیتے۔ کیا تاریخ عالم اس عدل کی نظیر پیش کر سکتی ہے؟

بھائیوں کے لئے ترکِ پستاں کریں — دودھ پیتوں کی نصفت پہ لاکھوں سلام

نیز فرماتی ہیں کہ اس سال قحط تھا۔ بارش نہیں ہوئی تھی جس کی وجہ سے بڑی عسرت تھی خصوصیت سے ہم بہت پریشان تھے۔ فاقوں سے رات کو نیند نہیں آتی تھی۔ ہمارے پاس ایک دبلی پتلی گدھی اور ایک اونٹنی تھی جس کے تھن خشک تھے۔ جب میں آنحضور کو لے کر ڈیرے پر پہنچی تو یک بیک

اونٹنی کا تھن چڑھ آیا۔ حارث گئے اور اس کا دودھ دوہ لائے ہم سب نے پیٹ بھر کر پیا اور پہلی مرتبہ زمانے کے بعد اس رات چین کی نیند آئی۔ اس پر حارث نے خوش ہو کر کہا اے حلیمہ یہ بچہ بڑی برکت والا معلوم ہوتا ہے۔

دستور تھا کہ بچوں کو لے کر دائیاں کچھ دن مکہ ٹھہرتیں۔ غالبًا یہ اسلئے تھا کہ بچے اپنی اپنی دائیوں سے مل مل جائیں۔ انھیں دنوں حضرت حلیمہ نے ایک رات دیکھا کہ آنحضرت کو ایک نور نے ڈھک لیا اور کوئی سرہانے کھڑا ہے۔ میں نے گھبرا کر اپنے شوہر کو جگایا انھوں نے دیکھ کر کہا اے حلیمہ چپ رہ اس راز کو کسی سے مت کہنا جس دن سے یہ بچہ پیدا ہوا ہے احبار یہود کو کھانا پینا اچھا نہیں لگتا۔

۷ نیز فرماتی ہیں واپس ہونے کے لئے جب آنحضور کو گود میں لے کر گدھی پر بیٹھی تو وہ فربہ و توانا چست و چوتند ہو گئی اور اتنی تیز رفتار کہ سب سواریوں سے آگے نکل گئی۔ کعبے کے قریب پہنچی تو سجدہ کیا۔ ساتھیوں نے اس کی قوت و تیزی دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔ حلیمہ یہ دوسری ہے یا وہی؟ میں نے جواب دیا ہے وہی مگر اس مبارک فرزند کی یہ برکت ہے۔ اس پر ساتھیوں نے کہا اس کی شان بہت بڑی ہے۔ قدرتِ خداوندی سے سواری کو گویائی ملی وہ بولی۔ ہاں بخدا میری شان بڑی ہے۔ میں مردہ تھی زندہ ہو گئی۔ دبلی تھی فربہ ہو گئی۔ اے زنانِ سعد! تعجب تم پر ہے کس غفلت میں ہو تمہیں پتہ نہیں کہ مجھ پر کون سوار ہے؟ سنو میرا سوار سید المرسلین، خیر الاولین والآخرین، حبیب رب العٰلمین ہے۔

نیز فرماتی ہیں قحط سے سبزہ کہیں نام کو نہ تھا لیکن ہم جس منزل پر پہنچتے سرسبز و شاداب ہو جاتی جب گھر پہنچے اور بکریاں جنگل میں چرنے کے بعد شام کو واپس آئیں تو خوب آسودہ تھیں۔ ان کے تھن دودھ سے بھرے تھے۔ کچھ ہی دنوں میں ہماری بکریاں خوب بحال ہو گئیں اور بچے دیئے۔ پوری

قوم کو حیرت تھی۔ انھوں نے اپنے چرواہوں سے کہا تم لوگ بھی اپنی بکریاں حلیمہ کی بکریوں کے ساتھ رکھو۔ اب پوری قوم ہماری بکریوں کے ساتھ اپنے ریوڑ رکھتی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے جانور بھی اس دُرِ یتیم کے فیض سے نہال ہو گئے۔

ایامِ شیرخواری کے عادات

فرماتے ہیں کہ دودھ پینے کے بعد غیب سے خود بخود آنحضور کا دہنِ اقدس صاف ہو جاتا۔ عام بچوں کی طرح اپنے کپڑوں میں پیشاب پاخانہ نہیں کرتے۔ ایک وقت معین تھا اسی وقت قضاء حاجت فرماتے۔ اگر کبھی ستر مبارک کھل جاتا تو مضطرب ہو کر ہاتھ پاؤں چلاتے، روتے جب تک میں چھپا نہ دیتی یا میں غفلت برتتی اور دیر ہو جاتی اور غیب سے خود بخود چھپا دیا نہ جاتا چین نہ لیتے، جب ہاتھ پاؤں میں چلنے پھرنے کی قوت آئی کھیلنے کودنے کے دن آئے اور بچے کھیلتے کودتے لیکن آنحضور کبھی کھیل کود میں شریک نہیں ہوتے، دور سے کھڑے ہو کر انھیں دیکھتے، انھیں کھیلنے کودنے سے منع فرماتے جب بچے اپنے شغل میں شریک ہونے کو کہتے تو فرماتے میں دنیا میں کھیلنے کے لئے نہیں آیا ہوں۔ رونے دھونے ضد وغیرہ کسی قسم کی بد خلقی نہ تھی۔ نشوونما غیر معمولی تھی۔ روزانہ آفتاب کے مانند ایک نور آکر آنحضور کو ڈھک لیتا اور کچھ دیر بعد غائب ہو جاتا بلا ناغہ روز دو سفید پوش یا دو مرغے سفید آتے اور گریبان اقدس میں سما جاتے جب بولنے کا سن آیا تو پہلا جملہ زبانِ اقدس پہ یہ جاری ہوا۔

اللہ اکبر اللہ اکبر الحمد للہ رب العٰلمین سُبحان اللہ بکرۃ واصیلا	اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے سب تعریف اللہ ہی کے لئے ہے جو تمام عالم کا پروردگار ہے۔ اللہ کے

لئے صبح و شام پاکی ہے۔

رات کو آہستہ آہستہ پڑھتے۔

لا الٰہ الا اللہ قدوسًا نامتِ	اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ ہر عیب
العیونُ الرحمٰنُ لاتاخذہ سنۃٌ	سے منزہ ہے۔ آنکھیں سو گئیں۔ اور
وّلا نومٌ	اسے اونگھ ہے نہ نیند۔

فرشتے گہوارۂ اقدس ہلاتے، چاند سے باتیں کرتے۔ جدھر اشارہ فرماتے ادھر چاند جھک جاتا۔ قبیلے میں کوئی انسان یا جانور بیمار ہوتا تو لوگ آپ کا دست مبارک ماؤف جگہ رکھ دیتے اور تکلیف دور ہو جاتی۔

حضرت حلیمہ کو آنحضور کا پاسِ ادب اتنا ملحوظ تھا کہ ایامِ رضاعت تک اپنے شوہر کو قریب نہیں آنے دیا۔ گرمی اور دھوپ میں کہیں جانے نہیں دیتیں۔ ایک دن حضرتِ حلیمہ کی غفلت میں اپنی رضاعی بہن شیما کے ساتھ باہر چلے گئے۔ حضرت حلیمہ نے جب گھر میں نہیں دیکھا تو بےچین ہو گئیں۔ تلاش میں نکلیں شیما کے ساتھ دیکھ کر شیما پر بہت خفا ہوئیں کہ دھوپ میں انھیں لئے کہاں پھر رہی ہے۔ شیما نے کہا آپ اطمینان رکھیں دھوپ سے انھیں کوئی تکلیف نہیں پہنچ سکتی۔ ان کے سر پر ابر سایہ کئے رہتا ہے حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بھی حضرت حلیمہ سے انتہائی محبت تھی۔ بعثت کے بعد ایک مرتبہ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئیں تو آنحضور میری ماں میری ماں کہہ کر لپٹ گئے۔

حضرت حلیمہ اور ان کے شوہر حارث بن عبدالعزیٰ دونوں اسلام لائے۔ حضرت حلیمہ کے بارے میں ابن کثیر نے لکھا ہے کہ وہ قبل بعثت ہی انتقال کر گئی تھیں لیکن یہ صحیح نہیں۔ جمہور علماء سیر نے اس کی تصریح کی ہے کہ وہ ایمان لائیں۔ صدر مغلطائی نے ان کے مسلمان ہونے پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جس کا نام "التحفۃ الجسیمۃ فی اثبات اسلام حلیمۃ" ہے۔

زمانہ بعثت میں حضرت حارث مکہ آئے۔ قریش نے ان سے شکایت کی سنو تمھارا بیٹا کیا کہتا ہے۔ کہتا ہے کہ اللہ عزوجل موت کے بعد سب کو قبروں سے اٹھائے گا۔ نیکو کاروں کو انعام عطا فرمائے گا۔ اور نافرمانوں کو سزائیں دے گا۔ اس نے ہم میں پھوٹ ڈال دی۔ اور ہمارا شیرازہ درہم برہم کر دیا۔ حارث خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا بیٹا لوگ شکایت کرتے ہیں کہ تم ایسا ایسا کہتے ہو۔ ارشاد فرمایا۔ وہ دن آنے دیجئے میں آپ کا ہاتھ پکڑ کر بتا دوں گا کہ میں سچ کہتا تھا۔ وہ ایمان لائے۔ ایمان لانے کے بعد کہا کرتے تھے۔ اس دن جب میرا بیٹا میرا ہاتھ پکڑے گا تو جنت میں داخل کئے بغیر نہیں چھوڑے گا۔

حضرت حلیمہ کی چار اولادیں تھیں۔ عبداللہ، شیما ۔ یہ دونوں ایمان لائے اور خذیفہ، اُنیسہ ان کا حال معلوم نہیں۔ ان میں شیما کو آنحضرت سے بہت محبت تھی یہی آنحضور کو کھلاتی بھی تھیں۔ ایک دفعہ آنحضور نے ان کی پیٹھ میں دانت کاٹ لیا تھا۔ غزوہ ہوازن میں صحابہ کرام نے گرفتار کرنا چاہا تو فرمایا میں تمھارے نبی کی رضاعی بہن ہوں۔ لوگ سرکار کی خدمت میں لائے۔ انہوں نے یہی نشان دکھا کر اپنا تعارف کرایا۔ عبداللہ ہم عمر تھے آنحضور کے ساتھ دودھ پیتے تھے۔

پہلی بار ایام رضاعت میں شرحِ صدر حضرت حلیمہ کے گھر قیام کے زمانے میں ہوا تھا۔ جس کی تفصیل معجزات کے بیان میں آئے گی۔ اجمالی بیان یہ ہے کہ ایک دن آنحضور نے حضرت حلیمہ سے کہا۔ مجھے بھی بھائیوں کے ساتھ جنگل جانے دو۔ تاکہ سیر بھی کروں اور بکریاں بھی چراؤں حضرت حلیمہ نے بالوں میں کنگھا کیا۔ سرمہ لگایا کپڑا پہنایا جزع یمانی کا ہار دفعِ نظرِ بد کے لئے گلے میں ڈالا لیکن آپ نے اسے پھینک دیا۔ اور فرمایا۔ میرا پروردگار میری حفاظت کے لئے کافی ہے۔ آنحضور بھائیوں کے ساتھ جنگل تشریف

لے گئے۔ دوپہر کے وقت حضرت حلیمہ کا ایک لڑکا روتا چلا آیا یا اُمّاہُ یا اُمّاہُ۔ کہتا ہوا آیا۔ اور کہا۔ "محمد کی خبر لو۔ حضرت حلیمہ نے قصہ پوچھا تو اس نے بتایا کہ ہم سب اکٹھے تھے کہ ایک شخص آیا اور انہیں لے کر پہاڑ کی چوٹی پر گیا۔ اور لٹا کر سینہ چاک کر دیا۔ اب آگے مجھے خبر نہیں کیا ہوا۔

یہ سنکر حضرت حلیمہ اور حارث دوڑے گئے دیکھا کہ آپ پہاڑ پر بیٹھے ہوئے آسمان کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ آنحضور نے انھیں گھبرایا ہوا دیکھ کر تبسم فرمایا۔ ان دونوں نے بڑھ کر سر اور آنکھ کو بوسہ دیا۔ حال پوچھا۔ آنحضور نے سارا واقعہ بیان فرمایا۔

مکہ واپسی اور گمشدگی

شرحِ صدر کے واقعہ سے لوگ ڈر گئے۔ سب نے حضرت حلیمہ سے کہا انھیں ان کی ماں اور دادا کے حوالے کر آؤ۔ حضرت حلیمہ نے بھی یہ رائے پسند کی اور آنحضور کو لے کر مکہ چلیں۔ جب قریب پہنچیں حضور کو تنہا بیٹھا کر قضاءِ حاجت کے لئے گئیں واپس آئیں تو حضور کا کہیں پتہ نہ تھا۔ بہت ڈھونڈا کہیں نہ ملے۔ ناامید ہو کر سر پیٹ پیٹ کر وَا مُحَمَّدَاہُ وَاوَلَدَاہُ کی فریاد بلند کرتیں۔ اچانک ایک مردِ پیر لاٹھی لئے آیا حال پوچھا۔ حضرت حلیمہ نے اپنی مصیبت سنائی اس نے کہا۔ بڑے بت ہبل کے پاس چلو وہ بتائے گا کہ وہ کہاں ہیں۔ حضرت حلیمہ نے اس سے کہا تیرا برا ہو۔ تجھے معلوم نہیں کہ ان کی ولادت کی رات تمام بت اوندھے گر پڑے تھے لیکن بڈھا زبردستی انھیں ہبل کے پاس لے گیا۔ بت پرستوں کی رسم کے مطابق اس کے اردگرد پھرا اور قصہ بیان کیا۔ ہبل اور تمام بت منہ کے بل گر پڑے ان کے جوف سے آواز آئی۔ اے بڈھے یہاں سے دور ہو۔ ان کا نام نامی ہمارے سامنے نہ لے۔ ان کے دستِ باطل شکن سے تمام بت اور بت پرستوں کی ہلاکت ہے۔ ان کا رب ان کا محافظ ہے۔ انھیں ضائع نہیں ہونے دے گا۔

حضرت حلیمہ وہاں سے مایوس ہو کر حضرت عبد المطلب کے پاس آئیں۔ عبد المطلب حلیمہ کو تنہا اور پریشان دیکھ کر کھٹکے۔ گھبرا کر پوچھا تم اتنی

پریشان کیوں ہو؟ محمد کہاں ہیں؟ حضرت حلیمہ نے سارا واقعہ سنایا۔ یہ سنتے ہی حضرت عبدالمطلب کوہ صفا پر آئے اور یا آل غالب کہہ کر قریش کو پکارا ایک آواز پر سارے قریش جمع ہو گئے۔ حضرت عبدالمطلب نے سب کو بتایا کہ میرا لخت جگر محمد غائب ہو گیا ہے۔ یہ سنتے ہی تمام قریش سوار ہو کر تلاش میں نکل پڑے۔ تمام پہاڑ جنگل چھان مارا۔ لیکن آنحضور کہیں نہیں ملے۔ مایوس ہو کر حضرت عبدالمطلب مسجد حرام شریف میں گئے۔ بیت اللہ کا طواف کیا۔ دعا مانگی، ہاتف غیبی نے تسلی دی۔ تم لوگ پریشان نہ ہو محمد کا نگہبان قادر قیوم ہے۔ وہ ضائع نہ ہوں گے۔ حضرت عبدالمطلب کی ڈھارس بندھی، پوچھا آخر وہ ہیں کہاں؟ جواب ملا۔ وادیِ تہامہ میں ایک درخت کے نیچے۔ حضرت عبدالمطلب وادیِ تہامہ گئے۔ راستے میں ورقہ بن نوفل بھی ساتھ ہو گئے۔ وادیِ تہامہ میں پہنچ کر دیکھا کہ ایک کھجور کے درخت کے نیچے ایک بچہ بیٹھا پتیاں چن رہا ہے۔ حضرت عبدالمطلب نے قریب جا کر پوچھا تم کون ہو؟ آپ نے فرمایا۔ میں محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب ہوں۔ حضرت عبدالمطلب نے اٹھا کر سینے سے چمٹا لیا۔ اپنے ساتھ گھر لائے زر و نقد، جانور صدقہ کئے۔ حضرت حلیمہ کو بھی انعام و اکرام سے مالا مال کیا۔ حضرت حلیمہ آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو واپس کرنے کے لئے آئیں تو تھیں لیکن جدائی شاق تھی۔ ادھر حضرت آمنہ قرۃ العین کو آنکھوں سے اوجھل ہونا پسند نہیں کرتی تھیں لیکن قسمت نے حضرت حلیمہ کی یاوری کی۔ اس وقت مکہ میں وبا تھی۔ اس لئے سب نے یہی مناسب جانا کہ کچھ دن بچہ اور بادیہ میں حضرت حلیمہ کے پاس رہے۔ یوں حضرت حلیمہ پھر اس دولتِ سرمدی سے مالا مال واپس ہوئیں۔ بعض مفسرین نے آیۃ کریمہ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى کی تفسیر اس واقعہ سے کی ہے۔ آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حضرت حلیمہ کے پاس کم و بیش چھ برس رہے۔

والدہ ماجدہ اور حضرت حلیمہ کے علاوہ آنحضور کی خدمت کا شرف حضرت ام ایمن کو ملا۔ یہ حضرت عبداللہ کی باندی تھیں۔ آنحضور کو میراث میں ملی تھیں۔ حضرت ام ایمن نے بھی حضور کی بڑی محبت کے ساتھ پرورش کی ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ میں نے دوسرے بچوں کی طرح حضور کو کبھی بھوک پیاس کی شکایت کرتے نہیں پایا۔ صبح کو زمزم پی لیتے اور شام تک کچھ نہ مانگتے۔ ایسا بارہا ہوا کہ چاشت کا کھانا پیش کیا جاتا تو فرماتے مجھے خواہش نہیں۔

مدینے کا سفر

والدہ محترمہ کا انتقال

جب آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حضرت آمنہ کے پاس آگئے۔ تو وہ آپ کو لے کر آپ کے دادا عبدالمطلب کے ننھیال مدینہ طیبہ گئیں۔ ساتھ میں ام ایمن بھی تھیں۔ بیٹے کو دادا کے ننھیال لے جانے کے بہانے اصل میں اپنے مرحوم سرتاج کی قبر پر حاضری مقصود تھی۔ وہاں بنی نجار میں دار نابغہ میں قیام کیا۔ ایک ماہ وہیں رہیں واپسی میں مقام ابوار میں بیمار ہوئیں اور فوت ہوگئیں۔ دفن بھی اسی مقام پر کی گئیں۔

اسماء بنت رہم کہتی ہیں کہ آمنہ کی بیماری میں میں ان کے پاس گئی تھی آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس وقت (اندازاً) پانچ سال کے بچے تھے۔ بیمار ماں کے سرہانے موجود تھے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان دنوں کی بہت سی باتیں یاد تھیں۔ ہجرت کے بعد ایک مرتبہ بنی عدی کے محلے سے گزرے تو اپنی جائے قیام پہچان کے فرمایا کہ اس گھر میں میری والدہ ٹھہری تھیں اس جگہ بیٹھتی تھیں۔ اس تالاب میں میں نے تیرنا سیکھا تھا۔ اسی میدان میں اُنیسہ کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ اس قلعے پر پرندے آکر بیٹھتے اور بچے اڑا دیا کرتے

یہودیوں نے مجھے دیکھ کر کہا تھا کہ آمنہ کا بیٹا پیغمبر ہے اور یہ اس کا دار ہجرت ہے۔

عبد المطلب کی کفالت

والدہ محترمہ کے انتقال کے بعد اُمِّ ایمن آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر مکہ آئیں حضرت عبد المطلب خود بھی یتیم رہ چکے تھے۔ سینے میں درد آشنا دل رکھتے تھے۔ انھوں نے آنحضور کی جس ناز برداری کیساتھ پرورش کی حضرت عبد اللہ بھی ہوتے تو شاید اس سے زیادہ نہ کرسکتے۔ اپنے تمام بچوں سے زیادہ پیار کرتے۔ خلوت میں ساتھ رکھتے تھے۔ بغیر آنحضور کے کھانا نہیں کھاتے۔ اور آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی بہت زیادہ ہل مل گئے تھے۔ انکے برابر مسند پر بیٹھتے۔ اگر کوئی روکتا تو حضرت عبد المطلب جواب دیتے۔ میرے بیٹے کو میری مسند پر بیٹھنے دو اس سے اسے احساس بزرگی ہوگا۔ مجھے امید ہے کہ میرا بیٹا شرف و بزرگی کی اس منزل پر پہنچے گا کہ نہ پہلے کوئی پہنچا ہے اور نہ آئندہ پہنچے گا۔ اہلِ قیافہ حضرت عبد المطلب کو تاکید کرتے کہ اس بچے کی پوری نگہداشت کرنا۔ مقام ابراہیم میں جو نشانِ قدم ہے اسکے ساتھ اس بچے کے قدم سے زیادہ کسی دوسرے قدم کو مشابہت نہیں۔

اسی سال حضرت عبد المطلب رؤسارِ قریش کے ساتھ سیف ذی یزن کی تہنیت کے لئے یمن گئے اس نے انھیں بشارت دی کہ تمھاری نسل سے پیغمبر آخر الزماں ہوں گے۔

دفع قحط

مکے میں ادھر کئی سال سے قحط تھا۔ اس سال اور سخت قحط پڑا۔ حضرت عبد المطلب غیبی اشارے سے آنحضور کو لے کر کوہِ ابو قبیس پر گئے اور حضور کو کاندھے پر اٹھا کر دعا کی اتنی کثیر بارش ہوئی کہ تلافیِ مافات ہوگئی۔

عبدالمطلب کی وفات

آنحضور کچھ ہی دن دادا کے پاس رہے تھے کہ ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس وقت حضور کی عمر مبارک تقریباً آٹھ سال کی تھی۔ اور حضرت عبدالمطلب کی بیاسی سال کی حضرت عبدالمطلب حجون میں دفن کئے گئے۔ جنازے کے ساتھ آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی تھے۔ جدائی کے غم سے روتے جاتے تھے۔

حضرت عبدالمطلب کی وفات کے بعد آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی پرورش ابوطالب نے اپنے ذمے لے لی۔ اور یہاں سے آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کا دوسرا دور شروع ہوا۔ دور ثانی کی تفصیلات سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم صفی اللہ علیہ السلام سے لے کر جناب عبداللہ تک تمام آبائے کرام و اُمّہاتِ عظام کی مذہبی حالت کا سرسری جائزہ پیش کر دیا جائے۔ تا کہ ناظرین کے ایمان میں مزید تنویر پیدا ہو۔

آبائے کرام کا اسلام

لم ازل انتقل من اصلاب الطاھرین الی ارحام الطاھرات
میں ہمیشہ پاک پشتوں سے پاک شکموں کی طرف منتقل ہوتا رہا۔
اس پر تمام امت کا اتفاق ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے آبائے کرام وامہات عظام بے حیائی وبدکاری سے ہمیشہ محفوظ رہے۔ خود آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ خرجت من نکاح لا سفاح میرا ظہور نکاح ہی کے ذریعہ ہوا، زنا سے نہیں۔ اسی طرح سرکار کے آبائے وامہات کفر وشرک کی گندگیوں سے بھی ملوث نہ ہوئے۔ یہی صحیح ومختار ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطی قدس سرہٗ وغیرہ نے اس پر جو دلائل قائم کئے ہیں ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

ا ——— ابونعیم نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

لم ازل انتقل من اصلاب الطاھرین الی ارحام الطاھرات — میں ہمیشہ پاک پشتوں سے پاک شکموں میں منتقل ہوتا رہا ہوں۔

ارشاد ربانی ہے۔

انما المشرکون نجس — مشرکین ناپاک ہیں۔

نجاست وطہارت دو متضاد چیزیں ہیں۔ ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتیں جب کہ حسب فرمانِ حدیث آبائے کرام اور امہات عظام طاہر تھے۔ تو

لازم کہ کفر و شرک کی گندگی سے آلودہ نہیں ہوئے۔

۲ ـــــــ بخاری[1] میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے

بعثت من خیر قرون بنی آدم قرناً فقرناً حتی بعثت من القرن الذی کنت فیہ۔	میں بنی آدم کے بہترین قرون میں مبعوث ہوا یہاں تک اس قرن میں تشریف لایا۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضور کے اجداد میں ہر جد اپنے زمانہ کے افضل ترین گروہ میں سے ہوا کرتا تھا۔

دوسری حدیث ہے۔

لم یزل علی وجہ الدھر سبعۃ مسلمون فصاعداً فلولا ذالک ھلکت الارض ومن علیھا	زمین پر ہمیشہ سات یا سات سے زیادہ مسلمان رہے۔ ورنہ زمین اور زمین والے بچتے نہیں۔

اس حدیث کو عبدالرزاق اور ابن منذر نے علیٰ شرط الشیخین حضرت علی سے روایت کیا ہے۔ اس کے ہم معنی امام احمد علی شرط الشیخین ابن عباس سے یوں راوی ہیں۔

ما خلت الارض من بعد نوح من سبعۃ یدفع اللہ بھم عن اھل الارض	حضرت نوح کے بعد سے زمین سات (ایسے نفوس قدسیہ) سے خالی نہیں ہوئی جن کے صدقہ میں زمین والے محفوظ رہتے ہیں

ان ہر دو حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد سے عہد بعثت تک کم از کم زمین پر سات مسلمان ضرور رہے۔ کافر و مسلم میں ظاہر ہے کہ فضیلت مسلم ہی کو حاصل ہے۔ تو جب کہ حضور کے آباء و اجداد اپنے زمانہ کے بہترین گروہ میں سے ہوا کرتے تھے تو لازم ہے کہ وہ مسلمان رہے ہوں ورنہ

---

[1] بخاری ۱، مناقب، ص ۵۰۳

بہترین گروہ میں نہ ہوں گے۔

۳ ـــــــ ابن عباس فرماتے ہیں کہ حضرت آدم سے حضرت نوح علیہ السلام تک دس پیڑھیاں ہیں اور سب شریعت حقہ کے پابند تھے اسے ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن منذر، بزار اور حاکم نے روایت کیا ہے۔ حاکم نے اسے صحیح کہا ہے۔

ابن سعد کی روایت میں یہ ہے کہ حضرت نوح تک تمام آبائے کرام اسلام پر تھے۔

رہ گیا حضرت نوح کے بعد تو حضرت نوح کے صاحبزادے حضرت سام کا مومن ہونا بالاجماع ہے اور بعض آثار میں ان کا نبی ہونا مُصَرَّح ہے حضرت سام کے صاحبزادے ارفخشد کے بارے میں ابن عباس نے مومن ہونے کی تصریح کی ہے۔ اس کے علاوہ ابن سعد نے روایت کی ہے کہ حضرت نوح سے لے کر نمرود کے قبل تک اہلِ بابل مسلمان تھے۔ نمرود نے انھیں گمراہ کر کے بتوں کی پرستش میں پھنسایا۔ نمرود ہی کا معاصر مشہور بت تراش آزر ہوا ہے جس کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کا باپ تھا۔ جیسا کہ خود کلام پاک میں اسے حضرت ابراہیم کا اَب کہا گیا ہے۔ جس کا ترجمہ باپ ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ حضرت ابراہیم کا باپ نہیں چچا تھا۔ اور اہل عرب چچا کو بھی اَب کہتے ہیں۔ یہ محاورہ خود کلام پاک میں بھی ہے۔

ارشاد ربانی ہے۔

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِیْ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ

جب یعقوب رحلت فرمانے لگے تو کیا تم لوگ وہاں موجود تھے جب کہ انھوں نے اپنے بیٹوں سے پوچھا تھا کہ میرے بعد کسے پوجو گے۔ تو انھوں نے کہا کہ آپ کے آباء و اجداد ابراہیم و اسمٰعیل

واسحٰق کے معبود کو۔

حضرت اسمٰعیل بنی اسرائیل کے چچا ہیں پھر بھی آبا ہیں انھیں داخل کیا گیا۔ اسی طرح آزر پر جو حقیقت میں حضرت ابراہیم کا چچا ہے "اب" کا اطلاق کر دیا گیا ہے۔ زرقانی میں ہے کہ شہاب ہیتمی نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ اہل کتاب اور تاریخ کا اس بات پر اجماع ہے کہ آزر حضرت ابراہیم کا باپ نہیں چچا تھا۔ اسی میں "الدرج المنیفة" سے نقل کیا کہ حضرت ابن عباس مجاہد، ابن جریج اور سدی نے کہا ہے کہ آزر حضرت ابراہیم کا باپ نہیں تھا۔ ان کے باپ کا نام تارخ تھا۔ اسی میں یہ بھی ہے کہ ابن منذر کی تاریخ میں ایک اثر میں اس کی تصریح ہے کہ آزر حضرت ابراہیم کا چچا تھا۔ اگر آزر حضرت ابراہیم کا باپ ہوتا تو حضرت ابراہیم تک شجرۂ پاک میں ایک ہی کافر ہوتا۔

اب جب کہ ائمہ مفسرین کے اقوال اور تاریخ کی تصریحات سے ثابت ہو گیا کہ آزر حضرت ابراہیم کا باپ نہیں چچا تھا۔ تو واضح ہو گیا کہ شجرۂ پاک حضرت ابراہیم تک کفر سے محفوظ ہے۔

رہ گیا۔ حضرت ابراہیم کے بعد تو نصوص قرآنیہ سے ثابت ہے کہ وادی غیر ذی زرع میں بسنے والی ذریت ابراہیم میں ایک گروہ ہمیشہ توحید پر قائم رہا۔

ارشاد ہے۔

اِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ لِاَبِیْهِ وَقَوْمِهٖۤ اِنَّنِیْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ ۝ اِلَّا الَّذِیْ فَطَرَنِیْ فَاِنَّهٗ سَیَهْدِیْنِ وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِیَةً فِیْ عَقِبِهٖ

یاد کرو جب ابراہیم نے اپنے چچا اور قوم سے کہا جنھیں تم پوجتے ہو ان سے میں بیزار ہوں سوائے اس ذات کے جس نے مجھے پیدا کیا وہ یقیناً مجھے راستے پر قائم رکھے گا۔ اللہ نے ابراہیم کے بعد

اسے کلمہ باقیہ کر دیا۔

خاتم المفسرین حضرت عبد اللہ بن عباس اور مجاہد سے مروی ہے کہ۔

انها لا الٰہ الا اللہ باقیۃ فی عقب ابراھیم — حضرت ابراہیم کے بعد باقی رہنے والا کلمہ لا الٰہ الا اللہ ہے۔

حضرت قتادہ سے منقول ہے

شھادۃ ان لا الٰہ الا اللہ و التوحید لا یزال فی ذریتہ من یقومها من بعدہ — لا الٰہ الا اللہ کی شہادت اور توحید کا قائل حضرت ابراہیم کی ذریت میں ان کے بعد ہمیشہ رہے گا۔

دوسری آیت خاص مکہ کے بارے میں یوں ہے۔

اِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّ اجْنُبْنِیْ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ — یاد کرو جب کہ ابراہیم نے کہا تھا، اے پروردگار اس شہر کو امن والا بنا۔ مجھے اور میری اولاد کو بتوں کی پرستش سے بچا۔

اسی سلسلہ دعا میں آگے چل کے ہے۔

رَبَّنَاۤ اِنِّیْۤ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ — اے رب میں نے اپنی کچھ ذریت ناقابل کاشت میدان میں تیرے حرمت والے گھر کے پاس بسائی ہے اے رب اسلئے کہ یہ لوگ نماز ادا کریں۔

اس کے آگے ہے۔

رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوةِ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ — اے رب مجھے اور میری ذریت کے کچھ لوگوں کو پابند نماز رکھنا۔

ابن منذر نے ابن جریج سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے۔

فلن تزال من ذریۃ ابراھیم ناس علی الفطرۃ یعبدون — پس اولاد ابراہیم سے کچھ لوگ ہمیشہ فطرت پر قائم رہ کر اللہ کی پرستش

اللہ کرتے رہیں گے۔

پہلی آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ عزوجل نے اولاد ابراہیم میں کلمۂ توحید باقی رکھا اس میں احتمال تھا کہ ہوسکتا ہے یہ خصوصیت اولاد اسحٰق میں چلی گئی ہو لیکن بعد والی آیات نے بالکل واضح کردیا کہ نماز کی پابندی اور بتوں سے اجتناب کی دعا خاص باشندگانِ مکہ کے لئے ہے۔ اگر حضرت ابراہیم جیسے اولوالعزم نبی کی یہ دعائیں مقبول ہوئیں تو ہر شخص کو یہ ماننا پڑے گا کہ بنی اسمٰعیل میں کچھ افراد ایسے ضرور ہوئے جو ملتِ حنفیہ کے پابند رہے۔ اور جن کا دامن شرک کی آلودگی سے بچا رہا۔ ظاہر ہے کہ خانوادۂ اسمٰعیل میں بانئ اسلام کے آباء و اجداد سے زیادہ کوئی متبع ابراہیم نہیں ہوا۔

اس قیاس سے قطع نظر کرتے ہوئے مؤرخین و محدثین کی تصریحات سے پتہ چلتا ہے کہ بنی اسمٰعیل ہی نہیں بلکہ تمام عرب عہد ابراہیم سے ملت ابراہیم کے پابند رہے۔ اور ان میں سے کسی ایک نے بھی کفر کا ارتکاب نہیں کیا یہاں تک کہ عمرو بن لحی نے بت پرستی پھیلائی۔ عمرو بن لحی کے معاصر اجدادِ کرام میں سے کنانہ تھے۔ اس سے ثابت ہوگیا کہ حضرت ابراہیم سے کنانہ تک تمام آبائے کرام مسلمان تھے۔ رہ گیا کنانہ کے بعد تو ان میں سے مرّہ تک کا اسلام تو تاریخ سے ثابت ہے مرہ کے بعد عبد المطلب تک چار پیڑھیاں ایسی ہیں جن کے بارے میں اسلام کی تصریح ہے نہ کفر کی۔ دلیل اول و دوم کے کلیہ سے ہی متبادر ہے کہ یہ بھی مسلمان ہی ہوں گے۔ اور اسی کلیہ سے حضرت عبد المطلب و حضرت عبد اللہ کا مسلمان ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں ان دونوں حضرات کے بارے میں بہت سے علمائے سیر نے تصریح کی ہے کہ یہ موحّد تھے۔

۴ ـــــــ ارشاد خداوندی ہے۔

وَھُوَ الَّذِیْ یَرٰاکَ حِیْنَ اللہ وہی ہے جو آپ کی شب زندہ داری

تَقُوْمُ وَتَقَلُّبَكَ فِی السّٰجِدِیْنَ — کو اور ساجدین میں منتقل ہونے کو دیکھتا ہے۔

اس آیت میں تصریح ہے کہ نورِ محمدی ساجدین سے ساجدین میں منتقل ہوتا رہا۔ یہ ساجدین مومنین کے علاوہ اور کون ہو سکتے ہیں۔

خاتم المفسرین حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

من نبی الی نبی ومن نبی	ایک نبی سے دوسرے نبی تک، اور،
الی نبی	ایک نبی سے دوسرے نبی تک۔

چونکہ اجداد کرام میں انبیا علیہم السلام کی تعداد جو یقینی طور پر معلوم ہے وہ صرف چھ ہے۔ حضرت اسمٰعیل، حضرت ابراہیم، حضرت نوح، حضرت ادریس، حضرت شیث، حضرت آدم، اس لئے اس کی توجیہ میں علامہ جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں۔

محل الاٰیۃ علی اعم منہو وھو	اس آیت کے لفظ ساجدین کو انبیا سے
المصلون الذین لو یزالوافی ذریۃ	اعم معنی پر محمول کرنا زیادہ واضح ہے یعنی
ابراھیم أوضح	وہ پابندِ صلوٰۃ جو اولادِ ابراہیم میں ہمیشہ رہے۔

اس استدلال پر بعض حضرات نے یہ اعتراض کیا ہے تفسیر بیضاوی میں ہے کہ اس آیت میں تقلب سے رات کو گشت کرنا اور ساجدین سے تہجد گزار حضرات مراد ہیں معنی یہ ہوئے کہ یہ اللہ وہی ہے جو آپ کے قیام کو بھی دیکھتا ہے اور رات کو اٹھ کر صحابۂ کرام کے احوال کے تفحص کرنے کو بھی دیکھتا ہے۔ لہٰذا آبائے کرام کے مسلمان ہونے پر اس آیت کی دلالت نہ رہی۔

اس کے جواب میں علامہ زرقانی فرماتے ہیں۔

وھذا التعقب بیت العنکبوت	یہ اعتراض مکڑی کا جالا ہے۔ کیونکہ بیضاوی
اذ لیس فی کلام البیضاوی نفی	کی تفسیر میں اپنی ذکر کردہ تفسیر کے علاوہ
لغیر ماذکرہ من التفسیر	دوسرے تفسیر کی نفی نہیں اور نہ اس پر

ولاحکایۃ اجماع علیہ بل ذکر بعدہٗ تفسیرًا اٰخر ان المراد بھم المصلون والرازی ایضًا لم ینف غیر التفسیر الذی ذکرہٗ۔ بل قال اقصی ما فی الباب حمل الایۃ علی وجوہٍ اخری لامنافات بینھا فتعقبہ باحد تفاسیرا عترف ھو بھا واشار الی الجمع بینھا مما لا یلیق تسطیرہٗ علی ان ما فسر بہ الرازی ھو الاولیٰ بالقبول۔

(جلد اول ص ۱۲۶)

اجماع منقول ہے، بلکہ ایک اور تفسیر مذکور ہے کہ ساجدین سے مراد مصلی ہیں اور امام رازی نے اپنی ذکر کردہ تفسیر میں علاوہ دوسری تفسیروں کی نفی نہیں کی بلکہ انہوں نے کہا ہے کہ انتہائی بات یہ ہے کہ آیت کو چند اور وجہوں پر حمل کیا جا سکتا ہے جن میں منافات نہیں تو جس تفسیر کا انہوں نے خود اعتراف کیا اور اس میں اور دوسری تفسیر میں تطبیق کی جانب اشارہ بھی کیا اسے لے کر اعتراض کرنا لکھنے کے لائق نہیں۔ علاوہ ازیں امام رازی نے جو تفسیر کی ہے وہ قبول کرنے کے زیادہ لائق ہے۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ آیت میں دو احتمالات ہیں ایک تو تقلب سے مراد نور کا پشت در پشت منتقل ہونا اور ساجدین سے آبائے کرام مراد ہیں۔ جو مومن اور موحد تھے۔

دوسرے یہ کہ تقلب سے رات کو حضور کا گشت کرنا اور ساجدین سے تہجد گزار مراد ہیں اور کسی آیت میں چند احتمالات پیدا ہو جانے سے کسی ایک احتمال کے لائق حجت ہونے پر کوئی حرف نہیں آتا۔ کیونکہ علمائے تفسیر فرماتے ہیں۔

القراٰن ذو وجوہ وھو حجۃ بکل وجہ مالم یتنافی۔

قرآن مختلف معنی کا احتمال رکھتا ہے۔ اور ہر معنی کے اعتبار سے حجت ہے۔ جب تک آپس میں منافات نہ ہو۔

یہاں یہ دونوں احتمالات آپس میں منافی نہیں ہیں لہذا اپنے مطلوب کے

اثبات کے لئے حجت ہیں۔

۵ ـــــ لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک قرأت اَنْفُسِكُمْ کے بجائے اَنْفَسِكُمْ مروی ہے جس کا ترجمہ ہوا بیشک تمہارے پاس تمہارے نفیس ترین میں سے ایک رسول آیا۔

جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ حضور کا شجرہ مبارکہ اہل عرب کے تمام شجروں سے نفیس ترین ہے اور یہ اسی وقت درست ہوگا جب کہ آنحضور کے اہل شجرہ مومن موحد ہوں جیسا کہ گزر چکا۔

۶ ـــــ صحیح مسلم شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں

ان اللہ اصطفیٰ کنانۃ من اولاد اسمٰعیل علیہ السلام واصطفیٰ قریشا من کنانۃ واصطفیٰ من قریش بنی ہاشم واصطفانی من بنی ہاشم	اللہ عزوجل نے اولاد اسمٰعیل میں کنانہ کو چنا اور کنانہ میں قریش کو اور قریش میں بنی ہاشم کو اور بنی ہاشم میں مجھے۔

اولاد اسمٰعیل میں ایک گروہ کا ہمیشہ مسلمان رہنا ثابت ہو چکا۔ پس اگر اولاد اسمٰعیل میں کنانہ کے سوا کوئی اور کنانہ میں قریش کے علاوہ کوئی اور قریش میں بنی ہاشم کے ماسوا۔ کوئی اور مسلمان ہوتا تو یہ اصطفا بے معنی ہو کر رہ جاتا اس لئے ماننا پڑے گا کہ بنی اسمٰعیل میں کنانہ اور کنانہ میں قریش اور قریش میں بنی ہاشم ہی حضرت ابراہیم کی توحید و تعلیم کے حقیقی وارث تھے اور یہ لوگ اس متاع گران بہا کی بدولت تمام عالم میں منتخب ہوئے۔

جب کہ روایت و درایت عقل و نقل اسکی مؤید ہیں آبائے کرام موحد و مومن تھے۔ تو اگرچہ بعض علما نے اس باب میں اس کا خلاف کیا ہے۔ پھر بھی ہم اسی بات پر یقین کرنے پر مجبور ہیں کہ حق یہی ہے کہ نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح بتصریح احادیث صحیحہ و اجماع علمائے سیر و حدیث نجاست سفاح سے منزہ رہا۔ اسی طرح کفر و شرک سے بھی مشکوٰۃ نبوت ہمیشہ

بے داغ رہا۔

تھوڑی دیر کے لئے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ آبائے کرام میں چند نفوس وقت کی رو میں بہ کر آلودۂ کفر ہو گئے تو بھی ادب و محبت کا تقاضا یہی ہے کہ ہم کفِ لسان کریں۔ کیونکہ اولاد کے سامنے والدین کے عیوب و گناہ بیان کرنا باعث ایذا ضرور ہوتا ہے۔

خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کے طعن سے شدت کے ساتھ منع فرمایا ہے۔

چنانچہ زرقانی نے ابن منذر سے روایت کیا ہے کہ۔ سبیعہ بنت ابی لہب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور شکایت کی کہ لوگ مجھے بنت حمالۃ الحطب کہتے ہیں۔ حضور کو جلال آ گیا۔ فرمایا۔

ما بال اقوام یوذوننی فی قرابتی	کیا بات ہے کہ کچھ لوگ رشتہ کے معاملہ
ومن اذانی فقد اذی اللہ	میں مجھے ایذا دیتے ہیں جس نے مجھے
	ایذا دی اس نے اللہ کو ایذا دی۔

اسی مقصد شریف کی ابحاث جلیلہ علامہ سیوطی کے رسائل ستہ اور اعلیٰ حضرت مجدد اعظم قدس سرہٗ کے رسالہ شمول الاسلام میں مطالعہ کریں۔
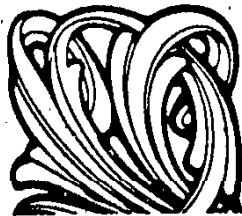
ابوطالب

حضرت عبدالمطلب کے اگرچہ بارہ بیٹے تھے لیکن انہوں نے حضور کی پرورش ابوطالب کے ذمے کی[1] کیونکہ یہ حضرت عبداللہ کے حقیقی بھائی تھے اوران دونوں میں کافی محبت تھی۔ ایک روایت[2] میں یہ بھی ہے کہ عبدالمطلب نے حضور کو اختیار دیدیا تھا کہ جس کے پاس جی چاہے رہیں۔ حضور نے ابوطالب ہی کو پسند فرمایا۔

حضرت عبدالمطلب کی طرح ابوطالب بھی آنحضور سے انتہائی محبت رکھتے تھے۔ سفر حضر میں ساتھ رکھتے۔ ایک آن کے لئے بھی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیتے تھے۔ ساتھ بٹھا کے کھلاتے پلاتے ساتھ سلاتے۔ گھر کے سب بچوں سے پہلے کھانا دیتے، امام واقدی[3] نے ذکر فرمایا ہے کہ اگر ابوطالب کے گھر والے بغیر آنحضور کے کھاتے تو آسودہ نہ ہوتے اور اگر آنحضور کے ساتھ کھاتے تو سیر ہو جاتے اسی لئے ابوطالب کا یہ طریقہ تھا کہ جب کھانا تیار ہو جاتا، اگر آنحضور تشریف فرمانہ ہوتے تو بچوں کو نہ کھلاتے اور کہتے رکو میرا بیٹا آجائے۔ آنحضور کے کھانے میں شریک ہونے سے اتنی برکت ہوتی کہ گھر کے سب افراد شکم سیر ہو کر کھاتے پھر بھی کھانا بچ رہتا، ایک پیالہ دودھ ہوتا اگر آنحضور پہلے منہ لگا دیتے تو گھر بھر کو کافی ہوتا اس اعجاز کو دیکھ کر ابوطالب کہا کرتے۔ اِنَّكَ لَمُبَارَكٌ (تم برکت والے ہو) امام

---

[1] زرقانی جلد اول [2] مدارج جلد دوم [3] زرقانی جلد اول

ابو نعیم[1] وغیرہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی ہے کہ ابو طالب کے اور بچے سو کر اٹھتے تو آنکھوں میں کیچڑ اور چندیا پن ہوتا مگر آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہمیشہ شگفتہ رو اٹھتے آنکھوں میں سرمہ اور بالوں میں تیل لگا ہوا نظر آتا۔

دفع قحط

ابو طالب کے زمانے میں بھی مکہ میں ایک بار شدید قحط پڑا استسقا کے لئے قریش ابو طالب کے پاس آئے یہ آنحضور کو لے کر حرم شریف میں گئے اور آنحضور کی پشت مبارک کعبہ سے لگا کر کھڑا کر دیا۔ آنحضور نے انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ فرمایا۔ آسمان بالکل صاف تھا۔ اشارہ کرتے ہی ابر کے ٹکڑے ہر چہار جانب سے امنڈ آئے اور برسنے لگے اتنی بارش ہوگئی کہ ندی نالے بہ نکلے۔

شعب ابی طالب میں محصوری کے زمانہ میں اسی اعجاز کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ابو طالب نے یہ قصیدہ کہا ہے[2]

وابیض یستسقی الغمام بوجھہ ثمال الیتمی عصمۃ للارامل

گورے چہرے والے جن کے صدقے میں بارش ہوتی ہے یتیموں کی جائے پناہ بیوگان کی آڑ

تلوذ بہ الھلاک من اٰل ھاشم فھم عندہ فی نعمۃ وفواضل

جن کے دامنِ کرم میں بنی ہاشم کے تباہ حال پناہ لیتے ہیں۔ اور یہ اُنکی بارگاہ میں چین سے ہیں

گھریلو مصروفیات

آنحضور جب کام کاج کے لائق ہو گئے تو گھر کے کام میں ہاتھ بٹانے لگے چنانچہ آپ نے بکریاں تک چرائیں۔ زمانۂ رسالت میں ایک بار صحابہ کے ساتھ مر الظہران میں تشریف لے گئے وہیں کہیں پیلو کا درخت تھا پھل لگے تھے لوگ توڑ توڑ کر کھانے لگے۔ آنحضور نے فرمایا۔ جتنا زیادہ کالا ہوگا اتنا ہی

---

[1] زرقانی جلد اول [2] طبقات ابن سعد جلد اول

زیادہ مزیدار ہوگا۔ یہ میں نے اس وقت جانا جب میں یہاں بکریاں چراتا تھا۔

فرانس[۱] کے ایک نامور مورخ نے اس پر یہ جڑ دیا کہ ابوطالب چوں کہ محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کو ذلیل جانتے تھے اس لئے ان سے بکریاں چرانے کا کام لیتے تھے۔

بکریاں چرانے کو ذلیل سمجھنا یورپ کی ذلیل ذہنیت کی اپج تو ہو سکتی ہے لیکن ایک عالی دماغ انسان اسے کبھی بھی ذلیل کام نہیں کہہ سکتا۔ اور عرب میں خصوصاً اس زمانے میں معززین و رؤسا کے بچے جانور چرایا کرتے تھے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے زمانۂ خلافت میں اس کا اعتراف کیا ہے کہ بچپن میں میرے والد مجھ سے اونٹ چرانے کا کام لیا کرتے تھے۔ واضح ہو کہ حضرت عمر کے باپ خطّاب صرف رؤسا قریش ہی میں سے نہ تھے بلکہ عہدہ داروں میں سے تھے۔ چنانچہ عہدۂ سفارت ان کے ذمہ تھا۔ خطّاب حضرت عمر کے باپ تھے، اس لئے یہاں یہ وہم بھی نہیں ہو سکتا کہ حضرت عمر سے چرواہی کا کام اس وجہ سے لیتے تھے کہ انھیں ذلیل جانتے تھے۔

خود حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دس سال تک حضرت شعیب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مویشی چرائے ہیں اور اپنی مرضی سے یہ کام قبول فرمایا تھا اس لئے یہاں کسی کے ذلیل سمجھنے کا سوال ہی نہیں۔

بات یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے لیے قبل نبوت یہ مشغلہ لازم ہے اس سے جفاکشی خطرات سے مقابلہ کی قوت اور تحمل و ضبط کی طبیعت خوگر ہو جاتی ہے۔ جس سے تبلیغ رسالت کے ایام میں قوم کے رَدِّ عمل سے تاثر کم ہوتا ہے۔ بخاری میں ہے۔

ما بعث اللہ نبیاً الا رعی الغنم   ہر نبی نے بکریاں چرائی ہیں۔ صحابہ نے

---

[۱] سیرۃ النبی جلد اول

فقال اصحابہ وانت فقال نعم کنت ارعاھا علی قراریط لاھل مکۃ

پوچھا آپ نے بھی؟ فرمایا میں نے بھی قراریط پر بکریاں چرائی ہیں اہل مکہ کی۔

قراریط کے دو معنی ہیں ایک سونے اور چاندی کے ٹکڑے۔ اس تقدیر پر یہ قیراط کی جمع ہے بعض محدثین نے یہاں یہی معنی مراد لئے ہیں۔ دوسرے ایک مقام کا نام ہے جو حوالی مکہ میں اجیاد کے قریب ہے۔ امام ابراہیم حربی نے فرمایا اس حدیث میں قراریط سے یہی جگہ مراد ہے۔ علامہ بدرالدین محمود عینی وغیرہ نے اسی کو راجح بتایا۔[1] ملا علی قاری نے اسی پر جزم فرمایا۔[2]

واقعات سیر کے استیعاب کے لئے علما نے اسے ذکر فرمایا ہے۔ ورنہ ایسے اجتماعات میں جو عوام و خواص سب پر مشتمل ہوں یہ اور اس قسم کے دیگر کوائف جنہیں سن کر ترحم تو پیدا ہو مگر وہ کمال تعظیم میں کسی طرح مخل ہوں بیان کرنے سے پرہیز لازم ہے۔ علامہ زرقانی فرماتے ہیں۔

سئل الحافظ عما یقع من بعض الوعاظ فی المولید فی مجالسھم الحفلۃ المشتملۃ علی الخاص والعام من الرجال والنساء من ذکر الانبیاء بما یخل بکمال التعظیم حتی یظھر للسامعین لھا حزن ورقۃ فیبقی فی حیز من یرحم لا من یعظم کقولہ لو تاخذہ المراضع لعدم ما لہ الا حلیمۃ رغبت فی رضاعہ شفقۃ علیہ وانہ کان

حافظ (ابن حجر سے) سوال ہوا کہ بعض واعظین میلاد شریف کی ان محفلوں میں جن میں عام و خاص مرد و عورت سبھی شریک ہوتے ہیں انبیا علیہم السلام کے وہ احوال بیان کرتے ہیں جو کمال تعظیم میں مخل معلوم ہوتے ہیں جسے سنکر سامعین پر اندوہ رقت طاری ہوتی ہے انبیا کرام اس زمرے میں معلوم ہوتے ہیں جن پر رحم کیا جائے اور نہ اس گروہ میں جن کی تعظیم کی جائے جیسے ان کا یہ کہنا کہ آنحضور کو دودھ پلانے

---

[1] عینی جلد ششم ص ۶۳۱ [2] شرح شفا جلد ثانی ص ۲۴۸

یرعی غنما وکثیر من ھذا المعنی المخل بالتعظیم فاجاب ینبغی ان یحذف من الخبر مایوھم فی المخبر عنہ نقصا

(جلد اول ص ۱۴۳)

والیوں نے نہیں لیا اس وجہ سے کہ آنحضور کے پاس مال نہ تھا مگر حلیمہ نے آنحضور پر شفقت کرتے ہوئے لے لیا اور یہ کہنا کہ آنحضور بکریاں چراتے تھے اس کے مثل اور دوسری باتیں جو تعظیم من ظاہر مخل ہیں تو انہوں نے جواب دیا ایسی باتیں نہیں ذکر کرنی چاہئے جن سے تنقیص کا وہم پیدا ہو۔

شام کا سفر اور بحیرا راہب سے ملاقات

قریش تجارت پیشہ تھے، سال میں دو سفر کیا کرتے تھے۔ جاڑوں میں یمن کا، گرمیوں میں شام کا، ابوطالب کا بھی یہی شغل تھا۔ آنحضور کی عمر مبارک کا بارہواں سال تھا، ابوطالب مال تجارت لے کر شام کے ارادے سے نکلے۔ سفر کی صعوبتوں کے خیال سے آنحضور کو ساتھ لے جانا نہیں چاہتے تھے لیکن آنحضور جب کسی طرح نہیں مانے تو ساتھ لے لیا۔

راستے میں شام کی سرحد پر ایک شہر بُصریٰ پڑتا تھا۔ یہاں گرجا میں ایک راہب رہتا تھا۔ جس کا نام جرجیس تھا جو بحیرا کے ساتھ مشہور تھا۔ یہ کتب سماویہ کا زبردست عالم اور صلاح وتقویٰ میں یگانہ تھا۔ اس نے کتب سابقہ میں پڑھا تھا کہ ایک دن خاتم النبیین اس راستے سے گزریں گے۔ موسم[1] میں جب قریش کا قافلہ گزرتا تو باہر آکر دیکھتا اور مایوس ہو کر لوٹ جاتا۔ امسال جب قافلہ اسکے گرجا کے پاس پہنچا تو وہ حسب عادت قافلہ میں آیا۔ لوگ ابھی محمل کھول

---

[1] مدارج جلد دوم ص ۳۵

رہے تھے وہ لوگوں کے درمیان ہوتا ہوا بڑھتا گیا اور آنحضور کا دست مبارک پکڑ کر کہا کہ یہ تمام عالم کے سردار ہیں۔ اللہ عزوجل انھیں رحمۃ للعلمین بنا کر مبعوث کرے گا۔ لوگوں نے پوچھا تمہیں کیسے معلوم ہوا۔ اس نے بتایا کہ جب تم لوگ گھاٹی سے نکلے تو انھیں تمام شجر و حجر نے سجدہ کیا۔ شجر و حجر سوائے نبی کے اور کسی انسان کو سجدہ نہیں کرتے۔ نیز میں ان کو خاتم نبوت سے پہچانتا ہوں، جو سیب کے مثل شانوں کے نیچے ہے۔

پھر اس نے تمام اہل قافلہ کی دعوت کی۔ قافلہ والے سب کے سب گئے لیکن آنحضور کو نہیں دیکھا تو آدمی بھیج کر بلوایا۔ حضور جب منزل سے چلے تو سر اقدس پر ابر سایہ کرتا ہوا ساتھ ساتھ آیا۔ لوگ ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھے تھے۔ آنحضور کے پہنچنے سے پہلے ہی تمام سایہ دار جگہ بھر چکی تھی۔ آنحضور ایک طرف بیٹھ گئے۔ درخت کا سایہ بھی اسی طرف جھک گیا۔ بحیرا نے قریش سے کہا۔ دیکھو۔ ان تمام علامتوں کو دیکھ کر بحیرا ایمان لایا۔[1] اس نے ابوطالب کو قسم دی کہ انھیں شام نہ لے جاؤ اہل روم ان کے دشمن ہیں علامتوں سے پہچان کر انھیں مار ڈالیں گے ابھی یہ بات چیت ہو رہی تھی کہ سات آدمی سامنے سے آئے۔ بحیرا ان کے پاس گیا آنے کا سبب پوچھا انھوں نے کہا ہمیں بتایا گیا ہے کہ نبی آخر الزماں اس مہینے شام میں تشریف لائیں گے تمام راستوں پر آدمی بھیج دیئے گئے ہیں کہ انھیں جہاں پاؤ قتل کر ڈالو۔ ہمیں ادھر اسی غرض سے بھیجا گیا ہے۔ بحیرا نے ان سے کہا۔ مجھے بتاؤ اگر اللہ کسی کام کے کرنے کا فیصلہ کر لے گا تو اسے کوئی روک سکتا ہے؟ وہ بولے نہیں۔ اب بحیرا نے ان سے کہا میری مانو چلو ان سے بیعت کر لو۔ اور ان کے ساتھ ہو جاؤ۔ پھر ابوطالب سے کہا کہ یہ بچہ خاتم النبیین ہے اس کا دین تمام دینوں

---

[1] مدارج جلد دوم ص۳۶

کا خاتم ہے۔ یہود اس کے دشمن ہیں انھیں شام نہ لے جاؤ۔ بحیرا کے اصرار سے مجبور ہو کر ابو طالب[۱] نے آنحضور کو مکہ واپس کر دیا۔ بحیرا نے توشہ کے لئے کیک اور روغن زیتون ساتھ کر دیا۔

چند یورپین کی بڑھ

صاحب سیرۃ النبی اس واقعہ کے بارے میں چند یورپین مورخین کی یہ تک بندی نقل کرتے ہیں۔ سرولیم میور۔ ڈریپر۔ مارگولوس۔ وغیرہ سب اس واقعہ کو عیسائیت کی فتح عظیم خیال کرتے ہیں اور اس بات کے مدعی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مذہب کے حقائق و اسرار اسی راہب سے سیکھے تھے۔ اور جو نکتے اس نے بتا دیئے تھے انھیں پر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے عقائد اسلام کی بنیاد رکھی اسلام کے تمام عمدہ اصول ان ہی نکتوں کے شروح و حواشی ہیں (جلد اول ص۱۷۹)

اسی کے حاشیہ پر ہے۔ ڈریپر صاحب معرکہ علم و مذہب میں لکھتے ہیں۔

بحیرا راہب نے بصریٰ کی خانقاہ میں محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کو نسطوری عقائد کی تعلیم دی۔ آپ کے ناتربیت یافتہ لیکن اخاذ دماغ نے نہ صرف اپنے اتالیق کے مذہبی بلکہ فلسفیانہ خیالات کا گہرا اثر قبول کیا۔ بعد میں آپ کے طرز عمل سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ نسطوریوں (عیسائیوں کے ایک مذہبی فرقے کا نام ہے) کے مذہبی عقائد نے آپ پر کہاں تک قابو پالیا تھا۔

---

[۱] سیرۃ النبی اول ص۱۷۹ ترمذی جلد دوم ص۲۰۲

سر ولیم میور صاحب نے بھی نہایت آب و رنگ سے ثابت کرنا چاہا ہے کہ آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بت پرستی سے جو نفرت پیدا ہوئی اور ایک مذہب جدید کا جو خاکہ آپ نے قائم کیا وہ سب اسی سفر اور اس کے مختلف تجارب اور مشاہدات کے نتائج تھے۔

ا ——— یورپین مصنفین کو اپنی روشن دماغی اور تجدد آفرین ذہن پر بہت ناز ہے۔ لیکن منصف جانتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جس مذہب کی بنیاد رکھی یا جس کی نشر و اشاعت فرمائی وہ عیسائیت سے اپنے جملہ اصول و فروع میں بالکلیہ مختلف ہے۔ مثلاً عیسائیت کی بنیاد تثلیث پر ہے اس کے برخلاف اسلام کی خشت اول توحید ہے اگر اسلام کی بنیاد کسی عیسائی معلم سے سیکھے ہوئے حقائق و اسرار اور نکتوں پر قائم ہوتی فروع میں نہ سہی اصول میں اتحاد ضروری ہوتا۔ یہ کس کی عقل میں آسکتا ہے کہ تلمیذ اپنے استاذ کے بتائے ہوئے تمام حقائق و اسرار و نکات کے علی الرغم اس کے متضاد اصول و فروع کی نشر و اشاعت کرے۔ استاذ کا بنیادی عقیدہ تثلیث۔ تلمیذ کا توحید۔ استاذ کا عقیدہ یہ ہے کہ عیسیٰ ابن اللہ ہیں۔ تلمیذ کا عقیدہ یہ کہ وہ ابن اللہ نہیں عبد اللہ ہیں۔ استاذ کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ عزوجل ابوت و زوجیت و توالد و تناسل سے ملوث ہے۔ تلمیذ کا عقیدہ یہ ہے وہ سبوح قدوس ان تمام خرافات سے مُنَزَّہ ہے۔ استاذ کا عقیدہ یہ ہے حضرت عیسیٰ سولی دیئے گئے۔ تلمیذ کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ سولی سے محفوظ رہے زندہ اٹھالئے گئے۔ استاذ کا عقیدہ یہ ہے کہ ہفتے میں ایک دن چند منٹ گرجا میں پادریوں اور ننوں کے گیت سن لینا عبادت ربانی کے لئے کافی ہے۔ تلمیذ کا عقیدہ یہ ہے کہ دن میں پانچ بار معبود برحق کی بارگاہ میں سجدہ کرو۔ استاذ کا عقیدہ یہ ہے کہ صلیب کو پوجو۔ تلمیذ۔ غیر اللہ کی پرستش کا سب سے بڑا مخالف۔ استاذ شراب و خنزیر مردار جائز جانے تلمیذ

ان سب کو حرام و اعمال شیطانی بتائے۔ استاذ سود، تمار کو مباح کہے۔ تلمیذ ان سب کو گناہ بتائے۔ استاذ کا قبلہ بیت المقدس، تلمیذ کا خانہ کعبہ۔ غرض کہ عقائد و عبادات و معاملات ہر ہر قدم پر تخالف پھر کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ بانیٔ اسلام نے اس عیسائی راہب کے سکھائے ہوئے حقائق و اسرار و نکات پر اسلام کی بنیاد رکھی ہے۔

اور اگر کوئی یہ کہے کہ اس راہب کے عقائد وہ نہ تھے جو اس دور کے عیسائیوں میں پھیل گئے تھے اور ان کی اتباع میں آج تک پھیلے ہوئے ہیں۔ عیسائیوں کے یہ عقائد راہبوں اور پادریوں کے مخترع ہیں۔ بحیرا راہب حقیقی و صحیح عیسائیت کا پابند تھا، جو اصول میں اسلام کے مطابق ہے۔ تو مہربان اس تقدیر پر ہمیں کہنے دیجئے کہ یہ اسلام کی عیسائیت پر فتح عظیم ہے۔ اسلام کا یہی دعویٰ ہے کہ آج عیسائی جس عیسائیت کا ڈھونگ رچائے ہیں اسے خدائی مذہب کہتے ہیں۔ یہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مذہب نہیں۔ آسمانی مذہب نہیں، بلکہ پادریوں کی ہوا و ہوس کی پیداوار اور ان کا گڑھا ہوا ہے۔ اس اقرار کے کرنے والوں کو اپنے آپ کو عیسائی کہتے ہوئے شرم سے پانی پانی ہو جانا لازم ہے۔ اس کے لئے سوا اس کے اور کوئی چارۂ کار نہیں کہ وہ دامن اسلام میں پناہ لے۔

۲______کسی واقعے سے نتیجہ اخذ کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسے صحیح مان لیا گیا نتیجہ خواہ غلط ہی کیوں نہ ہو جب ان مستشرقین نے بحیرا راہب کے واقعہ سے مذکورہ نتیجہ اخذ کیا تو لازم ہے کہ وہ اسے درست مانتے ہیں۔ اور جب یہ واقعہ درست تو پیغمبر اسلام کا نبی برحق، نبی آخر الزماں ہونا اور ان کے دین کا تمام ادیان سابقہ کا ناسخ ہونا ثابت۔ اس لئے کہ اس واقعہ میں تصریح ہے کہ عیسائیوں کے اس پیشوا نے اقرار کیا ہے۔

هٰذا سَيِّدُ الْعٰلَمِيْنَ هٰذا رسول   یہ تمام عالم کے سردار ہیں۔ یہ رب

رب العلمین یبعثہ اللہ رحمۃ للعلمین العلمین کے رسول ہیں۔ اللہ عزوجل انہیں (ترمذی ص۲۰۲ ج ۲) رحمتِ عالم بنا کر مبعوث فرمائے گا۔

اس میں یہ بھی ہے کہ بحیرا ایمان لایا۔ اور اس نے روم سے آنے والوں سے کہا۔ فبایعوہ واقیموا معہ (ان کی بیعت کرو اور ان کا ساتھ دو) اپنے مذہبی پیشوا کی مفروضہ تعلیم وتلقین پر فخر کرنے والو! اگر تم میں ذرا بھی حق پرستی ہے اگر حق پرستی نہیں ہے اپنی بات کا پاس ہے تو اپنے مذہبی پیشوا کا حکم مانو۔ آؤ انھیں سرور عالم، رسول رب العلمین، رحمۃ للعلمین مانو۔ ورنہ دنیا یہ کہنے پر مجبور ہوگی کہ تم میں حق پرستی تو کیا ہوگی خود اپنی کہی ہوئی بات کا پاس تک نہیں۔

۳ ——— اس واقعہ میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بحیرا سے دو بار ملاقات مذکور ہے۔ ایک اس وقت جب قافلہ پہنچا۔ دوسری دعوت میں۔ پہلی ملاقات کے وقت اس نے حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑ کر یہ کہا تھا۔ "ھٰذا سید العلمین"۔۔ الخ اس کے علاوہ اور کوئی بات اس نے نہیں کہی۔ دوسری ملاقات میں دعوت کے وقت تو کسی بات کے کہنے اور سننے کا کوئی تذکرہ نہیں اگر سب کے سامنے مذہب کے رموز و نکات سکھاتے ہوتے تو وہ بھی ضرور مذکور ہوتے اور اگر خلوت میں کوئی بات ہوئی ہوتی تو خلوت کا تذکرہ ہوتا۔ جب کسی روایت میں ان دونوں باتوں میں سے کوئی مذکور نہیں تو ناولسٹوں کی طرح سے اپنے دماغ سے واقعہ فرض کر کے اتنا بڑا دعویٰ کرنا تحقیق نہیں ابلہ فریبی ہے۔

۴ ——— پھر یہ کس ذی ہوش کو باور ہوگا کہ مختصر سی ملاقات میں ۱۲ سال کا بچہ وہ اسرار و رموز سیکھ جائے جس پر اسلام جیسے عظیم مذہب کی بنیاد قائم کی جا سکے۔ اور اگر یہ سیکھنے والے کا اعجاز ہے تو اس صاحب اعجاز کا کلمہ پڑھنے میں عار کیوں؟ آؤ ان کا کلمہ پڑھ لو۔ ہمارا تمھارا جھگڑا ختم۔

صاحب سیرۃ النبی بحیرا کے واقعہ کے بارے میں اپنا فیصلہ یہ صادر فرماتے ہیں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت ناقابل اعتبار ہے اس روایت کے جس قدر طریقے ہیں سب مرسل ہیں اس روایت کا سب سے زیادہ مستند طریقہ یہ ہے جو ترمذی میں مذکور ہے اس کے متعلق چند باتیں قابل لحاظ ہیں

۱ ـــــــ ترمذی نے اس روایت کے متعلق لکھا ہے کہ حسن اور غریب ہے اور ہم اس حدیث کو اس طریقہ کے سوا کسی اور طریقے سے نہیں جانتے جس کا مرتبہ صحیح حدیث سے کم ہوتا ہے اور جب غریب ہو تو اس کا مرتبہ اس سے بھی گھٹ جاتا ہے۔

۲ ـــــــ اس حدیث کا ایک راوی عبدالرحمٰن بن غزوان ہے اس کو بہت سے لوگوں نے اگرچہ ثقہ بھی کہا ہے لیکن اکثر اہل فن نے اسکی نسبت بے اعتباری ظاہر کی ہے علامہ ذہبی میزان الاعتدال میں لکھتے ہیں کہ عبدالرحمٰن منکر حدیثیں بیان کرتا ہے جن میں سب سے بڑھ کر وہ روایت ہے جس میں بحیرا کا واقعہ مذکور ہے۔

۳ ـــــــ علامہ ذہبی نے یہ لکھا ہے کہ میں اس حدیث کے بعض واقعات کو موضوع جھوٹا اور بنایا ہوا خیال کرتا ہوں۔

۴ ـــــــ اس روایت میں مذکور ہے کہ حضرت بلال اور ابوبکر بھی اس سفر میں شریک تھے حالانکہ اس وقت بلال کا وجود بھی نہ تھا اور حضرت ابوبکر بچے تھے۔

۵ ـــــــ اس حدیث کے اخیر راوی ابوموسیٰ اشعری ہیں وہ شریک واقعہ نہ تھے۔ اور اوپر کے راوی کا نام نہیں بتاتے۔ ترمذی کے علاوہ "طبقات ابن سعد" میں جو سلسلۂ سند مذکور ہے وہ مرسل یا معضل ہے۔

۶ ـــــــ حافظ ابن حجر روایت پرستی کی بنا پر اس حدیث کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ حضرت ابوبکر اور بلال کی شرکت بداہتہً

غلط ہے۔ اس لئے مجبوراً اقرار کرتے ہیں کہ اس قدر حصہ غلطی سے روایت میں شامل ہوگیا ہے، لیکن ابن حجر کا یہ ادعا بھی صحیح نہیں کہ اس روایت کے تمام رُواۃ قابلِ سند ہیں۔ عبدالرحمٰن بن غزوان کی نسبت خود ان ہی حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ وہ خطا کرتا تھا۔ اسکی طرف سے اسی وجہ سے شبہہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نے ممالیک کی روایت نقل کی ہے ممالیک کی ایک روایت ہے جس کو محدثین جھوٹ اور موضوع خیال کرتے ہیں۔ (ص۱۸۱ جلد اول)

اپنے استاذ کی تقلید میں ان کے بعض شاگردوں نے بھی اسے ناقابل اعتبار قرار دیا ہے اور جو کچھ ان کے استاذ نے کہا ہے اسی کو تھوڑی تفصیل کے ساتھ انھوں نے بھی سیرۃ النبی کی تیسری جلد میں لکھا ہے۔

مقدمہ کی ابحاث پر ایک نظر ڈال لیجئے اور پھر انھیں ذہن میں رکھ کر استاذ شاگرد کی اس تنقید کو پڑھئے تو آپ پر واضح ہو جائے گا کہ اس تنقید کی اہل علم کے نزدیک کوئی وقعت نہیں اس کا پورا جواب فصل معجزات میں آئے گا یہاں صرف ناظرین کی تشفی کے لئے چند باتیں ذکر کی جاتی ہیں۔

علامہ کی پہلی دلیل اس واقعہ کے ناقابل اعتبار ہونے کی یہ ہے کہ یہ حدیث مرسل ہے اسی کو پانچویں وجہ میں یوں بیان کیا ہے کہ اس حدیث کے اخیر راوی حضرت ابو موسیٰ اشعری ہیں جو خود شریک واقعہ نہ تھے۔ اور جس صحابی سے نقل کرتے ہیں اس کا نام نہیں لیتے۔

اگر کسی حدیث کے غیر معتبر ہونے کے لئے صحابی کا ارسال کافی ہو تو احادیث کا تقریباً نصف سرمایہ ردی کا طومار ہو جائے گا۔ اور تو اور صحاح ستہ حتیٰ کہ بخاری و مسلم بھی غیر مستند ہو جائیں گی۔ اس لئے کہ صحابہ کرام عام طور پر وہ واقعات روایت فرماتے ہیں جن میں شریک نہ تھے۔ اور تمام محدثین بالاتفاق اسے مقبول و معتمد جانتے ہیں خصوصاً حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ

حضرت ابوہریرہ، حضرت ابوموسیٰ اشعری، حضرت عبداللہ بن عباس کی صدہا روایتیں ایسی ہیں۔ حدیث کی جو کتاب اٹھائیے آپ کو ایسی مرویات کا ایک خزانہ ملے گا جو اس طرح منقول ہیں بلکہ خود ان دونوں محققین کی تالیفات اسی سے بھری پڑی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک روایت لیجئے۔ بدءِ نبوت[1] کی روایت ام المومنین حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے اور قبلہ کی اصح کتب بعد کتاب اللہ کے صنہ۲ لغایت صہ۲۰۲ جلد اول میں مذکور ہے۔

اور ہر مسلمان جانتا ہے کہ حضرت صدیقہ کا اس وقت حبالۂ عقد مبارک میں آنا تو بہت دور ہے ان کی ابھی پیدائش بھی نہیں ہوئی تھی۔ یہاں کیوں نہیں علامہ اور ان کے تلمیذ صاحب کو یہ نظر آیا کہ حضرت صدیقہ شریک واقعہ نہیں تھیں اور اس راوی کا نام نہیں لیتیں جس سے انہوں نے سنا ہے اس لئے یہ قابل اعتبار نہیں، اس حال کے پیش نظر میں سوائے اس کے کیا کہوں کہ یہ دونوں محققین مستشرقین کے ہفوات سے اتنے مرعوب ہو گئے کہ بحیرا کے واقعے کو ناقابل تسلیم بنانے کی سعی لاحاصل کی ہے۔ یا پھر ان صاحبان کا معیارِ تحقیق، روایت نہیں اپنا ذوق اور اپنی پسند ہے ورنہ سارے محدثین اس پر متفق ہیں کہ صحابی کا ارسال مطلقاً مقبول ہے۔ نہ صرف واقعاتِ سیر و ابوابِ فضائل میں بلکہ در بارۂ احکام بھی۔

اصولِ فقہ کی مشہور متداول کتاب نور الانوار میں ہے۔

فالمرسل من الاخبار ان کان من الصحابی فمقبول بالاجماع صہ۱۸۵	مرسل اگر صحابی سے ہے تو بالاجماع مقبول ہے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ خود تلمیذ صاحب کو اس کا اعتراف ہے۔ اسی

---

[1] اس حدیث کو ان بزرگوں نے مرسل مانا ہے ان کی تسلیم پر ہم نے مثال میں اسے ذکر کیا ہے ورنہ صحیح یہ ہے کہ وہ متصل ہے۔ منہ

بدء نبوت کے واقعہ پر تلمیذ صاحب حاشیہ سیرۃ النبی میں لکھتے ہیں۔

یہ روایت حضرت عائشہ سے مروی ہے۔ لیکن حضرت عائشہ اس وقت تک پیدا نہیں ہوئی تھیں۔ محدثین کی اصطلاح میں ایسی روایت کو مرسل کہتے ہیں۔ لیکن صحابہ کا مرسل محدثین کے نزدیک قابل حجت ہے۔ کیونکہ متروک راوی بھی صحابہ ہی ہوں گے۔ حاشیہ ص ۲۰۲

اس کی تفصیل یہ ہے کہ ہر صحابی عادل ہے۔ حدیث میں ہے۔

صحابی کلھم عدول — میرا ہر صحابی عادل ہے۔

تقاضائے عدل یہ ہے کہ وہ کوئی من گڑھت وفرضی واقعہ نہیں بیان کریں گے بلکہ وہی واقعہ بیان کریں گے جو انہوں نے خود رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سنا ہو یا کسی صحابی سے سنا ہو اور یہ درحقیقت اتصال ہے نور الانوار میں ہے۔

لان غالب حالہ ان یسمع بنفسہ منہ علیہ السلام وان کان یحتمل ان یسمع من صحابی اٰخر ولم یکن ھو بنفسہ حاضرًا (ص ۱۸۵)

اس لئے کہ اغلب یہ ہے کہ اس نے خود حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سنا ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ دوسرے صحابی سے سنا ہو اور وہ خود واقعہ کے وقت حاضر نہ ہو۔

رہ گیا عبدالرحمٰن بن غزوان یا بعض دوسرے رُواۃ کا بعض ناقدین کے نزدیک ضعیف ہونا اس سے لازم اگر آتا ہے تو صرف یہ کہ وہ حدیث کا یہ سلسلہ ضعیف ہے لیکن اگر کوئی حدیث چند طرق سے مروی ہو تو اگرچہ وہ سب ضعف رکھتے ہوں لیکن ضعیف ضعیف مل کر بھی قوت حاصل کر لیتے ہیں۔ بلکہ اگر ضعف غایت شدت وقوت پر نہ ہو تو جبرِ نقصان ہو کر وہ حدیث حسن بلکہ صحیح تک ہو جاتی ہے۔ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں ہے۔

تعدد الطرق یبلغ الحدیث — متعدد روایتوں سے آنا حدیث ضعیف

الضعیف الی حد الحسن — کو درجہ حسن تک پہنچا دیتا ہے۔

امام عبدالوہاب شعرانی قدس سرہ میزان الشریعۃ الکبریٰ میں فرماتے ہیں۔

قد احتج جمھور المحدثین بالحدیث الضعیف اذا کثرت طرقہ، والحقوہ بالصحیح تارۃً وبالحسن اخریٰ — جمہور محدثین نے حدیث ضعیف کو کثرت طرق سے حجت مانا۔ اور اسے کبھی صحیح اور کبھی حسن سے ملحق کیا۔

اور واقعۂ بحیرا کا تعدد طرق سے مروی ہونا خود علامہ کو مسلّم۔ خود لکھتے ہیں۔

" اس روایت کا سب سے مستند طریقہ یہ ہے جو ترمذی میں مذکور ہے صنہ ۱۸۱ سب سے مستند طریقہ اسی وقت ہو گا جب طرق کثیر ہوں۔

صنہ ۱۸۱ پر ہے " ترمذی کے علاوہ طبقات ابن سعد میں جو سلسلہ مذکور ہے "

اس سے معلوم ہوا کہ طبقات ابن سعد میں بھی یہ روایت ہے۔

تلمیذ صاحب جلد سوم میں فرماتے ہیں۔

" مگر ابن اسحٰق اور ابن سعد وغیرہ کتب سیر میں اس کے متعلق جس قدر روایتیں ہیں۔ ان سب کے سلسلے کمزور اور ٹوٹے ہوئے ہیں۔ حافظ سیوطی نے خصائص میں ابن سعد وغیرہ سے چند اور سلسلے نقل کئے ہیں مگر ان میں سے کوئی بھی محفوظ نہیں " (ملخصاً ص ۶۲)

خلاصہ یہ کہ اس کے تعدد طرق سے کوئی انکار نہیں کر سکتا اگر میں ان طرق کو نقل کروں تو بات طویل ہوگی۔ جب یہ محقق کہ یہ واقعہ تعدد طرق سے مروی اور علماء کا اس پر اتفاق کہ تعدد طرق سے حدیث درجہ حسن بلکہ درجہ صحت تک پہنچ کر مطلقاً مقبول خواہ احکام ہوں یا فضائل و سیر تو اب کوئی شبہہ نہیں رہ جاتا کہ یہ واقعہ مستند و معتمد ہے۔

ایک خاص بات یہاں ذہن نشین کر لیں کہ تعدد طرق کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ دس بیس طریقوں سے مروی ہے بلکہ صرف دو طریقوں سے مروی ہو جب بھی وہ قوی ہو جاتی ہے۔ تیسیر میں ہے۔

ضعیف لضعف عمرو بن واقد لکنہ یقوی بورودہٖ من طریقین

عمرو بن واقد کی وجہ سے ضعیف ہے مگر دو سندوں سے آکر قوت پاگئی۔

علاوہ ازیں تلقیِ امت سے بھی حدیث قوت پاتی ہے خصوصاً مرسل اور معضل کہ تلقی امت کے بعد امام شافعی کے یہاں بھی مستند ہو جاتی ہے۔

نور الانوار میں ہے۔

وعند الشافعی لایقبل الا اذا تاید بحجۃ قطعیۃ اوقیاس صحیح اوتلقتہ الامۃ بالقبول اوثبت اتصالہ بوجہ اخر۔

غیر صحابی کا مرسل اور معضل امام شافعی کے یہاں مقبول نہیں مگر جب کہ اس کی تائید حجت قطعیہ اور قیاس صحیح سے ہو یا امت اسے قبول کرے یا اس کا اتصال دوسرے طریقے سے ثابت ہو جائے۔

مرقاۃ میں ہے۔

قد صرح غیر واحد بان من دلیل صحۃ الحدیث قول اھل العلم بہ وان لم یکن لہ اسناد یعتمد علی مثلہ۔

ایک نے نہیں کثیر علماء نے تصریح کی ہے کہ حدیث کی صحت کی یہ بھی دلیل ہے کہ اہل علم اسے اخذ کرلیں اگرچہ اس حدیث کی کوئی سند قابل اعتماد نہ ہو۔

تعقبات میں امام بیہقی سے ناقل:

تداولھا الصالحون بعضھم عن بعض وفی ذالک تقویۃ الحدیث المرفوع۔

اسے صالحین نے ہاتھوں ہاتھ لیا ہے اور اس میں حدیث مرفوع کی تقویت ہے۔

امام ترمذی کا عام طریقہ ہے کہ بعض احادیث پر باعتبار سند کلام کرنے کے بعد فرمایا کرتے ہیں۔ والعمل علی ھذا عند اھل العلم۔

اس پر مرقاۃ میں ہے۔

وکَاَنَّ الترمذی یرید تقویۃ

امام ترمذی کی مراد اس سے یہ ہے کہ

الحدیث بعمل اھل العلم　　　اہل علم کے عمل سے حدیث قوی ہو جاتی ہے

واقعۂ بحیرا کے تلقی امت کا حال یہ ہے کہ ابن اسحٰق سے لے کر آج تک کے تمام مصنفین سیر ہی نے نہیں بلکہ اجلۂ محدثین نے بھی اپنی اپنی تصنیفات میں نقل فرمایا ہے۔ امام ترمذی اور ابن سعد کا اخذ تو علامہ نے خود نقل کیا ہے دوسرے حضرات کے اخذ کو ان کے تلمیذ سے سنئے۔ دیگر طرق کو جانے دیجئے صرف جامع ترمذی میں جو سند ہے اس کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"یہ قصہ اس سلسلۂ سند کے ساتھ جامع ترمذی، مستدرک حاکم، مصنف ابن ابی شیبہ، دلائل بیہقی، دلائل ابی نعیم میں مذکور ہے۔"

(ص ۱۶۲ ج ۳)

ص ۱۶۴ پر ہے۔

"امام بیہقی اس کی صحت کو صرف اس قدر تسلیم کرتے ہیں کہ یہ قصہ اہل سیر میں مشہور ہے۔ حافظ سیوطی نے خصائص میں امام موصوف کے اس فقرہ سے یہ سمجھا ہے کہ وہ بھی اس کے ضعف کے قائل ہیں۔ اسی لئے اصل روایت میں ابن سعد وغیرہ چند اور سلسلے نقل کئے ہیں مگر ان میں سے کوئی محفوظ نہیں ہے۔"

سلاسل اسناد کا محفوظ ہونا نہ ہونا یہ ایک الگ بحث ہے مگر یہ تو ثابت ہو گیا کہ یہ واقعہ امت میں مقبول و متداول ہے۔ اور جب تداول و تلقی سے حدیث ضعیف در بارۂ احکام حجت ہے تو باب فضائل میں بدرجہ اولیٰ مستند و معتمد ہو گی۔ ان سب سے قطع نظر بھی کر لیجئے تو زیادہ سے زیادہ یہی نہ ہوا کہ یہ ضعیف ہے۔ ہم مقدمہ میں نقل کر آئے کہ علماء سیر و مغازی ہی نہیں تمام محدثین کا اس پر اجماع ہے کہ باب فضائل میں حدیث ضعیف بھی مستند ہے اس لئے اگر ان محققین کی تنقید مان بھی لی جائے تو بھی اس خصوص میں اس کے لائق استناد ہونے میں کوئی شبہہ نہیں رہتا۔

ویسے واقعہ کے لحاظ سے یہ روایت مجموعی طور پر ضعف سے خالی ہے امام ترمذی نے اس کو حسن غریب کہا۔ اور حدیث حسن دربارہ احکام حجت ہے۔ امام حاکم نے اسے بخاری و مسلم کی شرط پر صحیح بتایا۔ امام ابن حجر نے "اصابہ" میں اس کے متعلق فرمایا "رجالہ ثقات" علامہ زرقانی شرح قسطلانی میں فرماتے ہیں۔

قال الحافظ ابن حجر فی الاصابۃ الحدیث رجالہ ثقات من رواۃ الصحیح وعبد الرحمٰن بن غزوان ممن خرج لہ البخاری ووثقہ جماعۃ من الحفاظ۔

ابن حجر نے اصابہ میں فرمایا اس حدیث کے راوی ثقہ ہیں۔ اور رُواۃ صحیح سے ہیں عبد الرحمٰن بن غزوان اس پائے کے راوی ہیں کہ امام بخاری نے ان سے روایت کی ہے اور ان کی توثیق حفاظ کی ایک جماعت نے کی ہے۔

فجار ثانی

آں حضور کی عمر مبارک کا بیسواں سال تھا کہ قریش اور قیس میں ایک سخت خون ریز جنگ ہوئی جس کا نام فجار رہے اس جنگ میں قریش حق پر تھے اس لئے آنحضور نے بھی شرکت کی لیکن کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ جنگ کی تفصیل یہ ہے۔

بنی کنانہ میں براض نام کا ایک شخص تھا کسی وجہ سے اہل قبیلہ نے اسے نکال دیا۔ یہ نعمان بن منذر کے یہاں چلا گیا۔ نعمان بن منذر ہر سال عرب کے بازاروں میں فروخت کے لئے مال بھیجا کرتا تھا جب عکاظ کے میلے کا زمانہ آیا۔ تو نعمان نے براض اور عروہ سے کہا۔ میرا ارادہ عکاظ میں کچھ مال بھیجنے کا ہے۔ تم دونوں میں کون اس کا ذمہ دار ہوتا ہے اس کے لئے دونوں تیار ہو گئے۔ اور اپنی اپنی ترجیح ثابت کرنے میں جھگڑ پڑے۔ عروہ زیادہ تجربہ کار تھا۔ اس لئے نعمان نے مال اسی کو دیا۔ عروہ جب مال لے کر نکلا تو اپنی خفت مٹانے کے لئے براض نے موقع پا کر عروہ کو قتل کر کے مال اپنے قبضہ میں کر لیا عروہ

کے قتل کی خبر جب بنی قیس کو ہوئی تو عروہ کا بدلہ لینے کے لئے قیس کے کچھ آدمی نکلے۔ براض نے فریب دے کر انھیں بھی قتل کر دیا۔ اور مکہ کی طرف چل دیا۔ ساتھ ہی خطرے کا احساس کر کے حرب بن امیہ کو اطلاع کر دی کہ وہ قیس کے مقابلہ کے لئے تیار رہے۔ یہ اطلاع حرب کو عکاظ میں ملی۔ اس نے قریش کے تمام سرداروں کو جمع کر کے مشورہ کیا۔ اور مصالحت کے لئے قیس کے سردار عامر بن مالک کے پاس ایک وفد بھیجا۔ صلح کی بات چیت جاری تھی کہ کسی نے قریش کو یہ افواہ پہنچا دی، کہ بنو قیس قریش پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ قریش یہ سنکر وہاں سے مکہ چل دیئے، عامر بن مالک نے اسے دھوکہ سمجھا اور فوراً ایک جمعیتہ لے کر قریش کے تعاقب میں اٹھ کھڑا ہوا۔ مکہ کے قریب دونوں میں جنگ ہوئی قریش پسپا ہوئے۔ اپنے بچاؤ کے لئے حرم میں ہٹ آئے۔ بنو قیس حرم کی حرمت کی وجہ سے حرم میں خوں ریزی کر نہیں سکتے تھے۔ اس لئے واپس ہو گئے اور الٹی میٹم دے گئے کہ آئندہ سال عکاظ میں ہمارا تمھارا فیصلہ ہو گا۔

سال بھر تک دونوں نے خوب تیاریاں کیں اور سال بھر کے بعد عکاظ کے میدان میں دونوں طرف کی فوجیں آجمیں۔ قریش کا سپہ سالار حرب بن امیہ حضرت ابو سفیان کا باپ اور حضرت معاویہ کا دادا تھا۔ اس جنگ میں تمام قریش شریک ہوئے۔ ہر خاندان نے اپنا اپنا پرچم لے کر الگ الگ صفیں قائم کی تھیں۔ بنی ہاشم کے علم بردار زبیر بن عبد المطلب تھے۔ انھیں کے ساتھ آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی تھے۔ بڑے زور کا رن پڑا۔ شروع شروع میں قریش کچھ دبے آخر میں سنبھلے اور بنو قیس کو بری طرح شکست دی۔ جب طرفین کے کچھ حوصلے ٹھنڈے ہوئے تو صلح پر جنگ کا خاتمہ ہوا۔ شرط یہ ہوئی کہ دونوں طرف کے مقتولین گنے جائیں۔ زائد کا خونبہا دے دیا جائے۔ یہ لڑائی چونکہ شہر حرام میں ہوئی تھی اس لئے اس کو فجار

کہتے ہیں۔ یہ زمانۂ جاہلیت کی سب سے مشہور اور بڑی جنگ ہے۔

حلف الفضول

زمانہ جاہلیت کی پیہم لڑائیوں کی بربادیوں سے متاثر ہو کر کچھ لوگوں کے دلوں میں امن قائم کرنے کی کسی ٹھوس تحریک کا خیال پیدا ہوا۔ ابھی یہ خیال عملی جامہ پہننے نہیں پایا تھا کہ ایک ایسا واقعہ ہوگیا۔ جس نے بالآخران لوگوں کو ایک اصلاحی تحریک "حلف الفضول" کے نام سے قائم کرنے پر آمادہ کر ہی لیا۔

ہوا یہ کہ بنوزہیر کے ایک تاجر سے عاص بن وائل نے کچھ مال خریدا اور قیمت نہیں دی۔ وہ بے چارہ فریاد کرتا پھرا۔ لیکن عاص بن وائل کے مقابل ہونے کی کسی میں جرأت نہ ہوسکی۔ ایک دن صبح کو قریش خانۂ کعبہ میں جمع تھے۔ اس شخص نے اس مجمع میں جاکر چند دردناک اشعار میں اپنی بےکسی ظاہر کی۔ زبیر بن عبدالمطلب اس سے بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے بنوہاشم، بنوزہرہ، بنوتیم کو، عبداللہ بن جدعان کے گھر جمع کر کے حلف الفضول کی تشکیل کی جس کی دفعات یہ تھیں۔

۱۔ ہم ملک سے بدامنی دور کرینگے۔ ۲۔ ہم مسافروں کی مدد کریں گے۔
۳۔ ہم غریبوں کی اعانت کریں گے۔ ۴۔ ہم مظلوم کا ظالم سے بدلہ لیں گے۔
۵۔ ہم طاقتور کو کمزور پر ظلم کرنے نہیں دیں گے۔

اس تحریک میں آنحضور بھی شریک تھے۔ اور اس کی اہمیت کو زمانۂ رسالت میں ان الفاظ میں ظاہر فرمایا۔

شهدت فی دار عبد الله بن جدعان حلفا لودعيت به فی الاسلام لاجبت

میں عبداللہ بن جدعان کے گھر ایک حلف میں شریک ہوا تھا۔ اگر اسلام میں بھی کوئی اس کے لئے بلائے تو میں تیار ہوں۔

دوسری جگہ یہ الفاظ ہیں۔ کہ اس معاہدہ کے بدلے اگر سرخ اونٹ

دیئے جاتے تو بھی نہ بدلتا۔ اس معاہدہ کو حلف الفضول اس لئے کہتے ہیں کہ پہلے بھی ایک دفعہ یہ تحریک اٹھ چکی تھی۔ جن کو پہلے پہل اس کا خیال آیا انکے نام فضیل و مفضل تھے۔ ان دونوں کا مادہ فضل ہے اور فضل کی جمع فضول ہے۔ اس لئے اس کا نام حلف الفضول پڑا۔ یہ لوگ جرہم اور قطورا کے قبیلہ کے تھے۔ یہ معاہدہ نسیاً منسیاً ہو گیا تھا مگر نیک نیتی کا فائدہ یہ ہے کہ ان کے نام اس یادگار کے ساتھ زندہ ہیں۔

تعمیر کعبہ

حضرت خلیل اللہ کے بعد قُصَی نے پرانی عمارت ڈھا کر نئے سرے سے بنوائی تھی اور کھجور کے تختوں کی چھت پاٹی تھی۔ مگر مرورِ زمانہ سے چھت جاتی رہی صرف قدآدم دیواریں قائم رہیں عمارت نشیبی علاقے میں تھی۔ بارش میں پانی حرم میں آجاتا تھا اسکی روک کے لئے پانی کے درآمد کی جگہ بندھ تھا مگر وہ ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا اور سیلاب کا پانی کعبہ کی دیواروں سے ٹکراتا۔ جس سے عمارت خستہ ہو گئی تھی۔ اس پر مستزاد یہ ہوا کہ ایک بار ایک عورت کی انگیٹھی سے جو کعبہ کو بخور دے رہی تھی پردے میں آگ لگ گئی اور بڑھ کر پوری عمارت اس کی لپیٹ میں آگئی جس سے کئی جگہ سوراخ ہو گئے اور عمارت کافی مخدوش ہو گئی اس لئے اس کی تعمیر جدید کا خیال قریش کو ہوا۔ باہمی مشورے سے جب یہ طے ہو گیا کہ قدیم عمارت اٹھا کر نئی اور مستحکم بنائی جائے تو چندے کا کام شروع ہوا۔ ابو وہب[1] بن عائذ مخزومی نے یہ رائے پیش کی کہ اس مقدس عمارت میں کوئی پیسہ حرام کا نہ لگے۔ سب نے اس کی پابندی کی لیکن قدیم عمارت ڈھانے کی ہمت کسی کو نہیں ہوتی تھی۔ ابرہہ کی بربادی کو آنکھوں سے دیکھنے والے سیکڑوں موجود تھے۔ کافی لیت و لعل کے بعد سب سے پہلے ہمت کر کے ولید بڑھا۔ اور پہلے یہ عرض کیا۔ اے اللہ! ہم نہ تو تیرے دین سے اکتائے ہیں اور نہ

---

[1] عینی۔

نکلے ہیں۔ اور ہماری نیت اچھی ہے۔ یہ عرض کر کے رکن اسود اور رکن یمانی کی جانب والی دیوار ڈھائی۔ بقیہ حصہ چھوڑ دیا۔ لوگ رات بھر انتظار کرتے رہے کہ دیکھیں ولید کو کوئی آفت تو نہیں پہنچی۔ اگر وہ ٹھیک رہا تو بقیہ عمارت ڈھا کر نئی عمارت بنائی جائے گی، ورنہ گرے ہوئے حصہ کی مرمت کر کے چھوڑ دیا جائے گا۔ صبح کو ولید جب بخیر و عافیت ملا تو سب نے مل کر قواعد ابراہیم تک دیواریں گرا دیں۔ کسی نے قواعد ابراہیم کو بھی کھودنا چاہا۔ پہلا ہی پتھر سرکا تھا کہ سارا مکہ لرز گیا۔ ایک بجلی کوندگئی۔ اب کس کی مجال تھی کہ آگے بڑھتا۔ قواعد ابراہیم ہی پر دیواریں چننی شروع کر دیں۔ ایک روایت میں ہے کہ لوگوں نے جب عمارت ڈھانی شروع کی تو ایک کالا سانپ نکلا۔ لوگ گھبرا کر مقام ابراہیم کے پاس بھاگے۔ ولید نے لوگوں سے کہا تم سب عہد کرو کہ اپنے رب کے گھر میں پاک مال لگاؤ گے۔ سب نے یہ عہد کیا اور دعا کی۔ الٰہی اگر ہمارے اس اقدام میں تیری رضا ہو تو اس سانپ کو دفع فرما۔ فوراً ایک پرندہ عقاب کے مشابہ جس کی پیٹھ سیاہ اور پیٹ سفید اور ٹانگیں زرد تھیں آیا اور سانپ لے کر اڑ گیا اس کے بعد کام اور آگے بڑھایا گیا۔

انھیں دنوں جدہ کی بندرگاہ پر ایک جہاز ٹکرا کر بیکار ہو گیا تھا قریش نے ولید بن مغیرہ کو بھیجا اس نے جدہ پہنچ کر جہاز کے تختے مول لئے اور جہاز والوں میں ایک باقوم نام کا رومی معمار تھا۔ اس کو بھی لایا۔ قریش نے بڑے جوش و خروش سے پوری یکجہتی کے ساتھ کام شروع کیا۔ چھوٹے بڑے سب خود مزدوروں کی طرح کام کرتے۔ خود حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کاندھوں پر پتھر ڈھو ڈھو کر لاتے۔ یہاں تک کہ شانے چھل گئے تھے۔ قریش کی شاخوں نے اپنے اپنے حصے الگ کر لئے تھے کہ اس شرف سے سب کو حصہ ملے لیکن جب حجرۂ اسود کو اپنی جگہ نصب کرنے کا موقع آیا تو شدید

نزاع اٹھ کھڑی ہوگئی۔ ہر قبیلہ یہ چاہتا تھا کہ یہ اہم کام اس کے ہاتھ سے انجام پائے۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ تلواریں نیاموں سے نکل آئیں۔ زمانۂ جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ جب کوئی جان دینے کی قسم کھاتا تو پیالہ میں خون بھر کر انگلیاں ڈبو لیتا اس وقت بھی کچھ جوشیلے لوگوں نے یہ خونی عہد کیا۔

چار دن تک جھگڑا ہوتا رہا۔ پانچویں دن ابوامیہ بن مغیرہ نے یہ رائے دی کہ کل صبح جو شخص سب سے پہلے حرم میں آئے، وہی حکم مان لیا جائے۔ یہ قریش میں سب سے زیادہ سن رسیدہ تھا۔ ہزار گئے گزرے ہونے کے باوجود قریش میں بڑے بوڑھوں کا تھوڑا بہت پاس تھا۔ اس لئے سب نے اس کی یہ رائے مان لی۔

دوسرے دن قریش کا ہر فرد سب سے پہلے حرم میں داخل ہونے کے ارادے سے گھر سے چلا لیکن جب اندر داخل ہوئے تو سب نے دیکھا کہ نور دیدۂ خلیل اللہ سب سے پہلے مرکز توحید میں پہنچ چکا ہے۔ وفور مسرت میں سب کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ "جاء الامین جاء الامین" آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سارے قبائل کو اس شرف سے بہرہ ور فرمانے کے لئے یہ ترکیب کی۔ ایک چادر بچھا کر اس میں حجر اسود رکھا۔ اور قبائل میں سے ایک ایک سردار کو منتخب فرمایا، اور ان سے کہا کہ سب مل کر چادر اٹھائیں۔ جب چادر اونچی ہو کر وہاں پہنچ گئی جہاں حجر اسود نصب کرنا تھا، تو آپ نے اپنے دست حق پرست سے حجر اسود کو اٹھا کر اس کی جگہ رکھ دیا۔ اس طرح قبلۂ عالم کا تکمیلی پتھر آپ کے ہاتھوں نصب ہوا۔ آپ کے حسن تدبیر سے ایک خوفناک جنگ بھی ختم ہو گئی اور ہر قبیلہ اپنی اپنی جگہ خوش بھی رہا۔

اب کعبہ پر چھت بھی بنا دی گئی۔ لیکن سامان عمارت کی کمی کی وجہ سے کعبہ کا ایک حصہ چھوڑ دیا گیا کہ پھر کبھی آئندہ اسے ملا کر بنا لیں گے۔ ایک دیوار اٹھا دی گئی۔ اسی حصے کو حطیم کہتے ہیں حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

نے فرمایا ہے کہ اہل مکہ کے نئے مسلمان ہونے کی وجہ سے اگر ان کے بھڑک جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں کعبہ ڈھا کر حطیم ملا کر اسے مکمل کر دیتا۔ حضرت[1] عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ۶۵ھ میں اس ارشاد کی تکمیل کی۔ جب حطیم[2] کی دیوار ڈھا کر نیو کھودی گئی تو قواعد ابراہیم کے پتھر ملے انھیں پر دیوار چنی گئی۔ مگر مشہور مروانی سفاک عبدالملک بن مروان کے عہد میں اسکے خونخوار درندے حجاج نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو سولی دے دینے کے بعد اس عمارت کو ڈھا کر عہد جاہلیت کے مطابق پھر بنا دی۔ کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے احیا سنت کا یہ نشان کیوں باقی رہے۔ منصور نے جب حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سنا تو حضرت امام مالک رضی اللہ عنہ سے اجازت طلب کی کہ پھر قواعد ابراہیم پر حطیم کو لے کر کعبہ بنا دیا جائے۔ تو امام مالک نے اجازت نہیں دی اور فرمایا۔ میں کعبہ کو شہنشاہوں کا بازیچہ نہیں بنانا چاہتا۔ تعمیر کعبہ کے وقت آنحضور کی عمر مبارک ۲۵ سال کی تھی۔

---

[1] عینی۔ [2] بخاری ص۲۱۶ جلد ۱
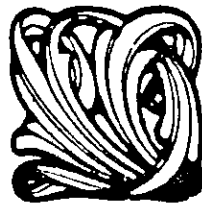
کسب معاش و تاہل

وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنٰى اور اللہ نے تمہیں تہی دست پایا تو غنی کر دیا

جب آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کاروبار کے لائق ہو گئے تو تجارت ہی کا شغل اپنے لئے منتخب فرمایا۔ تجارت کے لئے ہوشمندی کے ساتھ ساتھ تجربہ بھی لازم ہے۔ بچپن میں ابو طالب کے ساتھ تجارت کے لئے سفر کرنے سے پختہ کاری آچکی تھی اسی لئے جب آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کاروبار شروع فرمایا تو تھوڑے ہی دنوں میں حسن کارکردگی حسن معاملہ کی عام شہرت ہو گئی۔ بڑے بڑے رؤسا کا یہ دستور تھا کہ اپنا مال کسی دیانت دار ماہر کو شرکت پر دے دیا کرتے۔ آں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس اتنا سرمایہ نہ تھا کہ اپنا ذاتی کاروبار کرتے اس لئے لوگوں کا مال بطور مضاربت لے کر تجارت کیا کرتے۔ جن جن لوگوں کے ساتھ معاملہ رہا انھوں نے آپ کی صلاحیت، امانت، ایفاے عہد کی ہمیشہ تعریف کی۔ چنانچہ رب العلمین کی امانت کبریٰ کا امین قبل ظہور نبوت ہی امین کے لقب سے مشہور ہو چکا تھا۔

شرکاے تجارت میں سے سائب رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب مسلمان ہوئے تو لوگوں نے ان کی تعریف کی۔ آنحضور نے فرمایا۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں انہوں نے عرض کیا فداك ابی وامی آپ میرے شریک تجارت تھے لیکن معاملہ ہمیشہ صاف رکھا۔ فکنت لاتداری ولا تماری آپ نہ کبھی لڑتے اور نہ کبھی جھگڑا کرتے۔ (ابو داؤد۔ باب ۱۷)

اسی طرح آپ کے دوسرے شریک تجارت قیس بن سائب مخزومی

رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ شرکت داروں کے ساتھ آپ کا معاملہ ہمیشہ صاف رہتا تھا۔ کبھی کسی قسم کا جھگڑا انہیں پیش آتا تھا۔ تفسیر کے مشہور امام مجاہد انہیں کے غلام تھے۔

عبداللہ بن ابی الحمسار اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں قبل نبوت میں نے حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کچھ چیزوں کی خرید و فروخت کی بات چیت کی تھی۔ ابھی بات ادھوری رہ گئی تھی کہ میں پھر آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا عجب اتفاق کہ تین دن تک مجھے اپنا وعدہ یاد نہ رہا۔ تیسرے دن جب میں اس جگہ پہنچا تو آنحضور کو منتظر پایا۔ مگر میرے حسب وعدہ نہ پہنچنے اور تین دن تک انتظار کی زحمت برداشت کرنے کے باوجود چہرۂ اقدس پر کوئی ملال کا اثر نہ تھا۔ ہاں صرف اتنا فرمایا۔ میں یہاں تین دنوں سے ہوں تم نے مجھے مشقت میں ڈال دیا۔ شام، بُصریٰ، یمن کے علاوہ حضور نے جن جن مقامات کے سفر کئے ان میں جواثی جرش بحرین کا ذکر ملتا ہے۔ عام الوفود میں جب بحرین کے مشہور قبیلہ عبدالقیس کا وفد آیا تو آپ نے وہاں کے ایک ایک مقام کا نام لے کر پوچھا لوگوں کو تعجب ہوا۔ عرض کیا حضور ہمارے ملک کو ہم سے اچھی طرح جانتے ہیں فرمایا میں نے تمہارے ملک کی اچھی طرح سیر کی ہے۔

حضرت خدیجہ

عرب کے رؤسا میں حضرت خدیجہ بنت خویلد بہت ہی ممتاز تھیں قریش کا کاروانِ تجارت جب چلتا تو آدھا سامان ان کا ہوتا، اور آدھے میں پورا قافلہ۔ دولت کے ساتھ ساتھ قدرت نے اس دور جہالت میں بھی غیر معمولی حسن وجمال کے باوجود ان کو عصمت وعفت، شرافت ونجابت سے مالا مال کر رکھا تھا۔ اسی بنا پر ان کا لقب طاہرہ تھا۔ ان کا نسب پانچویں پشت میں قصی پر آنحضور سے مل جاتا ہے۔ ان کی دو شادیاں پہلے ہو چکی تھیں۔ ایک ابوہالہ ہند بن نباس تمیمی سے۔ دوسری عتیق بن عائذ مخزومی سے۔ اس وقت یہ بیوہ تھیں۔

اپنا سامانِ تجارت مضاربتہً دوسروں کو دیا کرتی تھیں۔ آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عمر مبارک کا پچیسواں سال تھا۔ قریش کا قافلہ سفر کی تیاری کر رہا تھا۔ ادھر حضرت خدیجہ کو کسی تجربہ کار راست باز امانتدار آدمی کی تلاش تھی جو ان کا مال تجارت لے جائے۔ آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بڑھ کر انھیں کون امین ملتا؟ انھوں نے آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بلا کر مال سپرد کر دیا اور اپنے غلام میسرہ اور ایک رشتہ دار خزیمہ کو ساتھ کر دیا۔

نسطورا سے ملاقات

کاروان تجارت جب بُصریٰ پہنچا تو اب کی بار ایک دوسرے راہب نسطورا کی خانقاہ کے قریب اترا۔ نسطورا نے آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیکھ کر میسرہ سے پوچھا یہ کون ہیں میسرہ نے بتایا تو نسطورا نے کہا۔ اس درخت کے نیچے سوائے نبی کے اور کوئی نہیں اترا۔ پھر پوچھا کیا ان کی آنکھوں میں یہ سُرخی ہمیشہ رہتی ہے۔ میسرہ نے کہا کہ ہاں! ہمیشہ رہتی ہے۔ یہ سنکر نسطورا نے کہا یہ وہی ہیں یہ وہی ہیں۔ یہی آخر الانبیاء ہیں۔ اے کاش کہ میں ان کی نبوت کا زمانہ پاتا۔ پھر راہب خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ اور سر اقدس اور قدم پاک کو بوسہ دیا اور عرض کیا، میں آپ پر ایمان لایا۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ ہی وہ ہیں جن کا ذکر اللہ عزوجل نے توریت میں کیا ہے۔ اسی اثنا میں خاتم نبوت پر اس کی نظر پڑی تو اسے بوسہ دیا۔ اور کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول نبیِ امی ہیں جن کی بشارت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی انھوں نے بتایا تھا کہ میرے بعد اس درخت کے نیچے نبی امی ہاشمی عربی مکی صاحب حوض اور شفاعت کے سوا اور کوئی نہیں قیام کرے گا۔ آپ نے وہیں بُصریٰ کے بازار میں سامانِ تجارت بیچ کر دوسری اشیا خریدیں۔ ایک شخص سے خرید و فروخت میں اختلاف ہوگیا۔ اس نے کہا لات و عزیٰ کی قسم کھاؤ۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے کبھی نہیں ان کی قسم کھائی ہے۔

اس پر اس نے آپ کی بات مان لی۔ اور میسرہ کو تنہائی میں لے جا کر کہا "یہ نبی ہیں" قسم ہے اس کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے۔ یہ وہی ہیں جن کے اوصاف ہمارے احبار اپنی کتابوں میں پاتے ہیں میسرہ نے یہ سب باتیں نوٹ کر لیں۔ میسرہ نے یہ بھی دیکھا کہ دوپہر میں دو فرشتے سر اقدس پر سایہ کرتے ہیں۔ قافلے کے دیگر افراد بھی یہیں مال بیچ کر واپس ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دونا نفع ہوا حضرت خدیجہ نے بھی جو معاوضہ طے تھا اس سے دونا دیا۔

عقدِ نکاح

جب حضور مکہ واپس ہوئے تو دوپہر کا وقت تھا۔ حضرت خدیجہ اپنے بالاخانہ پر سہیلیوں کے ساتھ قافلہ کی واپسی کا منظر دیکھ رہی تھیں۔ انھوں نے دیکھا کہ دو فرشتے چڑیوں کی شکل میں سر اقدس پر سایہ کئے ہوئے ہیں۔ حضرت خدیجہ نے اپنی سہیلیوں کو بھی دکھایا یہ دیکھ کر حضرت خدیجہ کے دل میں آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بے پناہ محبت پیدا ہو گئی۔ پھر جب میسرہ نے خدیجہ سے نسطورا کی باتیں بازار کا واقعہ اور راستے کے حالات بتلائے تو یہ جذبہ اس حد تک پہنچ گیا کہ ان کے دل میں آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے نکاح کا عزم مصمم پیدا ہو گیا۔

چنانچہ اس سفر سے واپسی کے کم و بیش تین ماہ بعد حضرت خدیجہ نے ایک عورت کو آنحضور کے پاس بھیجا کہ وہ اندازہ کرے کہ آپ شادی کی رغبت رکھتے ہیں یا نہیں۔ اس عورت نے آکر آنحضور سے عرض کیا۔ "اے محمد! (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) آخر آپ شادی کیوں نہیں کرتے؟ حضور نے جواب دیا شادی کا سرانجام کہاں سے کروں ہاتھ خالی ہیں اس عورت نے کہا اگر کوئی عورت ایسی ملے جو نسوانیت کے کمالات کی جامع ہوتے ہوئے آپ کے تمام اخراجات کی کفیل ہو تو؟ آنحضور نے دریافت فرمایا ایسی کون عورت ہے؟ اس نے حضرت خدیجہ کا نام لیا۔ اور بتایا کہ وہ آپ

سے بہت کافی محبت رکھتی ہیں اور آپ سے شادی کی خواہشمند ہیں۔ اگر آپ رضامندی ظاہر کریں تو نہایت آسانی کے ساتھ یہ معاملہ طے ہو جائے گا۔ آنحضور نے اپنی رضامندی ظاہر فرما دی، اس عورت نے آکر حضرت خدیجہ کو خوشخبری سنائی۔

حضرت خدیجہ نے اپنے چچا عمرو بن اسد کو بلا کر اپنے ارادہ کی اطلاع دی۔ اس کے بعد نکاح کی تاریخ مقرر ہوئی۔ تاریخ معینہ پر آنحضور معزز ین خاندان و دوست و احباب کے ساتھ جن میں ابو طالب، حضرت حمزہ، حضرت ابو بکر بھی تھے۔ حضرت خدیجہ کے گھر تشریف لے گئے۔ آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف سے ابو طالب نے پہلے خطبۂ نکاح پڑھا۔ پھر حضرت خدیجہ کی طرف سے ان کے چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل نے پڑھا ورقہ بن نوفل جب خطبہ سے فارغ ہو چکے تو ابو طالب نے کہا بہتر ہوتا کہ خدیجہ کے چچا عمرو بن اسد بھی خطبہ پڑھیں۔ اس پر عمرو بن اسد نے بھی یہ کہا۔ اے قریش گواہ ہو جاؤ میں نے خدیجہ بنت خویلد کو محمد بن عبداللہ کے نکاح میں دیا۔

نکاح کے بعد حضرت خدیجہ نے آنحضور سے کہا کہ اپنے چچا سے فرمائیں کہ ایک دو اونٹ ذبح کر کے دعوتِ ولیمہ کریں۔ شادی چونکہ پرورش کی آخری حد ہے۔ اسلئے اس اخیر بار سے سبکدوش ہو جانے کے بعد ابو طالب مطمئن ہو گئے اور شکریئے میں یہ الفاظ کہے۔

الحمد للہ الذی اذھب عنا الکرب ورفع الھموم۔ اس اللہ کے لئے حمد ہے جس نے ہم سے بے چینی کو دور کیا اور غم کو اٹھالیا۔

بعض مفسرین نے آیۃ کریمہ وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ (اللہ نے آپ کو تہی دست پایا تو غنی کر دیا) کی تفسیر یہ کی ہے کہ خدیجہ جیسی مالدار عورت سے نکاح کرا کے آپ کو غنی کر دیا۔

نکاح کے وقت آنحضور کی عمر ۲۵ سال تھی اور حضرت خدیجہ کی چالیس

سال ، یہی صحیح ہے ، مہر کے بارے میں روایتیں چار آئی ہیں ۔ بیس نوجوان اونٹ ۔ پانچ سو درم ۔ چار سو مثقال ، بارہ اوقیہ اور ایک نش ۔ پھر یہ سوال ہوتا ہے کہ چاندی یا سونا ؟ علامہ احمد خطیب قسطلانی اور علامہ عبدالباقی زرقانی نے یہی اختیار فرمایا کہ مہر سونا تھا ۔ مقدار کے بارے میں جو اختلاف ہے اس کو یوں دور کیا جا سکتا ہے کہ بارہ اوقیہ اور ایک نش کی مقدار پانسو درم ہے ۔ اسلئے کہ ایک اوقیہ چالیس درم کا اور نش نصف اوقیہ کو کہتے ہیں جو بیس درم ہوئے جس کی میزان پانسو درم ہوئی اس لئے پانسو درم اور ساڑھے بارہ اوقیہ اور نش کی روایتوں کا حاصل ایک ہی ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ بیس اونٹ کی قیمت اس زمانہ میں پانسو درم سونا ہوتی ہو اس لئے ان تینوں روایتوں کا حاصل ایک ہی ہوا ! البتہ چونکہ چار سو مثقال کا وزن ۱ ، ۵ درم سے بھی زائد ہے اس لئے ان دونوں کا حاصل ایک نہیں ہو سکتا نہ باعتبار وزن نہ باعتبار قیمت اس لئے کہ اس مبارک عہد میں ایک مثقال سونا کی قیمت دس درم تھی یعنی ایک تولہ سونا کی قیمت ۷ روپے ایک نیا پیسہ تھا ، اس طرح چار سو مثقال سونے کی قیمت ساڑھے چار ہزار درم کے قریب ہوتی ہے ۔ اس لئے علامہ زرقانی نے اس کی توجیہ یہ کی کہ مہر پانسو درم طلائی عقد کے وقت مقرر ہوا تھا ۔ مگر بعد میں آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مہر میں اضافہ فرما دیا ۔ اس طرح اس کی مقدار چار سو مثقال ہو گئی ۔ واللہ تعالیٰ اعلم

حضرت خدیجہ جس مکان میں رہتی تھیں ، وہ انھیں کے نام سے مشہور تھا ۔ طبری نے یہاں تک لکھا کہ ان کے عہد میں بھی وہ مکان حضرت خدیجہ کے نام سے مشہور تھا ۔ حضرت امیر معاویہ نے اس مکان کو خرید کر مسجد بنا دیا ۔

آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی جتنی اولاد ہوئیں سب حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہی کے بطن سے ہوئیں ۔ سوائے حضرت ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے یہ حضرت ماریہ قبطیہ کے بطن سے تھے ۔

خصوصی احباب

جس طرح ہر شخص کے کچھ خصوصی احباب ہوتے ہیں۔ آنحضور کے بھی تھے۔ ان میں سب سے نمایاں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ یہ مختلف سفر میں بھی ہمرکاب رہے۔ نکاح کے وقت برات میں بھی شامل تھے۔ دوسرے حکیم بن حزام حضرت خدیجہ کے چچازاد بھائی ہیں۔ یہ آنحضور سے عمر میں ۵ سال بڑے تھے۔ قریش کے سربرآوردہ رئیس تھے۔ دارالندوہ انھیں کی ملک تھا۔ جسے اسلام کے بعد ایک لاکھ درہم میں امیر معاویہ کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ اور کل رقم خیرات کردی منصب رفادہ انھیں کے سپرد تھا۔ یہ اگرچہ ۸ھ میں ایمان لائے۔ لیکن حالتِ کفر میں بھی آنحضور سے بے پناہ محبت رکھتے تھے۔ ہجرت کے بعد مکہ میں ایک بار ذویزن کا اسباب نیلام ہوا تھا۔ اس میں سے ایک عمدہ حلہ پچاس اشرفیوں میں خریدا اور مدینہ طیبہ خدمت اقدس میں لے کر حاضر ہوئے۔ پیش کیا۔ آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا میں مشرکین کا ہدیہ نہیں لیتا۔ اگر قیمت لو تو لے لوں گا۔ مجبور ہو کر انھوں نے قیمت لی۔ اور آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حلہ لے لیا۔ تیسرے دوست ضماد بن ثعلبہ ازدی تھے۔ جاہلیت میں طبابت، جراحی، جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے۔ عہدِ نبوت میں ایک مرتبہ مکہ آئے تو دیکھا کہ آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم آگے آگے اور لونڈوں کا غول شور مچاتا ہوا پیچھے پیچھے ساتھ ہے۔ مکہ کے جاہل آنحضور کو مجنوں کہتے تھے۔ ضماد نے بھی آنحضور کو اس حالت میں دیکھ کر یہی سمجھا۔ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ عرض کی۔ محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) اگر کہو تو تمھارا ابھی علاج کردوں۔ حضور نے جواب میں مشہور خطبہ الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ" پڑھا۔ یہ معجز کلمات سنکر عرض کیا۔ پھر پڑھئے حضور نے پھر پڑھا۔ پھر عرض کیا اور پڑھئے۔ حضور نے تیسری بار پڑھا۔ کلمات رسالت کا اعجاز اپنا کام کرگیا۔ ضماد کے دل سے ظلمات کے پردے

اٹھ گئے۔ عرض کیا میں نے کاہنوں کے کلام سنے ہیں۔ ساحروں کے سنے ہیں شاعروں کے سنے ہیں لیکن یہ بات کسی میں نہیں۔ یہ اتھاہ سمندر ہیں ہاتھ بڑھایئے کہ میں بیعتِ اسلام کروں۔ ضماد آنحضور کا علاج کرنے کی نیت سے آئے تھے۔ مگر دل میں خلوص تھا جو قبول ہوا۔ خود مرضِ کفر سے شفا پا گئے۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ورقہ بن نوفل سے بھی دوستی تھی۔

دنیا کی حالت

آفتاب رسالت کے طلوع کے وقت دنیا پر کتنی ہمہ گیر ظلمت کی دبیز تہیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اس کا اندازہ اس وقت دنیا کی مذہبی، اخلاقی، تمدنی حالت سے کیا جاسکتا ہے اسلئے ضروری ہے کہ اس وقت کی متمدن قوموں کی حالت کا ایک مختصر خاکہ ذہن میں رکھ لیا جائے۔ اس وقت عرب کے علاوہ یہ قومیں زمین کے آباد حصے پر حکمراں اور اپنے اپنے مذہب و تہذیب کی اجارہ دار تھیں۔ روم، فارس، ہندوستان، یورپ، چین جن میں یہ مذاہب موجود تھے۔ عیسائیت، مجوسیت، ویدک دھرم، بدھ مت یہودیت۔

فارس یہ عرب کے پڑوسی اور دنیا کی دوسری بڑی قوت تھے یہاں ساسانی خاندان فرمانروا تھا۔ شاہ گشتاشپ کے عہد میں زرتشت پیدا ہوا۔ اس نے آگ کی پرستش کو ذریعۂ نجات بتایا خیر و شر کے دو الگ الگ خالق، یزداں و اہرمن بتائے۔ یہ اعتقاد بجائے خود شرک سے آلودہ تھا۔ بعد کی بدعتی ترقیات نے اسے اور زیادہ گندہ کر دیا۔ باپ کا بیٹی سے، بھائی کا بہن سے نکاح کر لینا ان کے یہاں

جائز تھا۔ آخر میں مزدک نام کا ایک شخص پیدا ہوا جس نے زر، زمین و زن کو ہر شخص کی مشترکہ ملکیت قرار دیا، جس کی وجہ سے عیاشی، بدافعالی خواص سے لے کر عوام تک میں پھیل گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اہل ایران متاہل زندگی کے بجائے مجرد رہنا زیادہ پسند کرنے لگے۔ نوشیرواں نے اس گندگی کو بزورِ شمشیر ختم کرنے کی کوشش کی اور بظاہر کامیاب بھی ہوا، مگر جو آوارگی گھٹی میں پلادی گئی تھی وہ نہ جاسکی۔

بادشاہ و والیان کو سجدہ کیا جاتا، رؤسا و امراء کو بڑے بڑے جرم پر بھی سزا نہیں دی جاتی، شراب خوری عام تھی، مطلب برآری کے لئے خوں ریزی و قتل کوئی جرم نہیں تھا۔ حیرت ہے ایران کا ضرب المثل عادل نوشیرواں تخت حکومت حاصل کرنے کے لئے ہزاروں عزیزوں ملکی عہدیداروں اور دوسرے لوگوں کا بلا دریغ خون بہاتا ہے لیکن یہ خوں ریزی بھی اس کی عدل گستری کو داغدار نہ کرسکی۔ مزدور، کسان ناتواں، نادار کے لئے ایران کی بارگاہ دادرس میں کوئی گنجائش نہیں تھی۔ جنگ کے موقعوں پر مفتوح قوموں کیساتھ جو بہیمانہ سلوک ہوتا اس سے انسانیت کانپ اٹھتی۔

روم کسی وقت یہ دنیا کی سب سے بڑی سلطنت تھی۔ لیکن آپس کے اختلافات کی بدولت ۳۲۵ء میں اس کے دو حصے ہو گئے۔ ایک شرقی دوسرا غربی۔ مشرقی حصہ عرب کے پڑوس شام، فلسطین، ایشیاء کوچک سے لے کر یورپ تک وسیع تھا۔ جس کے زیر نگیں بڑے بڑے والیانِ ملک تھے، عرب کے متعدد سرحدی قبائل باجگزار تھے۔

یہی وہ ملک تھا جس میں مریم عذرا کے لخت جگر کلمۃ اللہ مبعوث ہوئے لیکن ان بدنصیبوں نے ان کے امن و آشتی کے پیغام کا دار و رسن سے استقبال کیا۔ مدت العمر کی جدوجہد کے نتیجے میں ۱۲ اشخاص ایمان لائے۔ ممکن تھا کہ یہی بارہ اشخاص متحد و متفق رہ کر روح اللہ کے پیغامات

کو نئی زندگی بخشتے۔ لیکن سوئے اتفاق ایک یہودی جس کا نام پال تھا منافقانہ عیسائیت میں داخل ہوا۔ اور اس نے عیاری سے عیسائیت کی توحید خالص کو تثلیث سے گندہ کر دیا۔ تعلیمات عیسوی کے شہد میں بدعات کے زہر ہلاہل ملا کر پیروانِ مسیح کو اس طرح ہلاک کر دیا کہ انھیں شعور تک نہ ہوا۔ کتنا ستم ہے جس نے دنیا کو یہ سبق پڑھایا کہ اگر کوئی تمھارے ایک رخسار پر طمانچہ مارے تو دوسرا بھی تم اس کے سامنے کر دو۔ اس معلم امن و صلح کے پیروؤں نے سفاکیوں میں دنیا کے تمام ریکارڈ توڑ ڈالے۔ اسقف اعظم کے عہدے کو حاصل کرنے کے لئے سیکڑوں خون ناحق کئے جاتے۔ خاص گرجاؤں میں بھی کشت و خون سے نہیں چوکتے۔ حضرت عیسیٰ حضرت مریم اور حواریوں کے مجسمے بنا کر پوجے جانے لگے۔ پادریوں کے سامنے اقرار گناہ کر کے گناہ سے پاک ہو جانے کے عقیدے نے جرائم کے بے خوف ارتکاب کا غیر مختتم سلسلہ قائم کر دیا۔ پادریوں بطریقوں کو سجدے کئے جاتے، مرنے کے بعد ان کی قبریں پوجی جاتیں۔ رہبانیت، تجرد، علائق دنیوی سے کنارہ کشی لازم مذہب بنا لیا گیا۔ کنواری بتول کی سنت کے احیا کے نام پر گرجا کی خدمت کے لئے کنواری عورتیں رکھی جانے لگیں۔ جنہیں ننیں کہا جاتا ہے گرجا کے مقدس مذہبی پیشوا ان کنواریوں کے ساتھ جو رنگ رلیاں مناتے ہیں اس سے معبد کے در و دیوار پناہ مانگتے۔

یہود

موسیٰ کلیم اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات کی اتباع کے مدعی یہود بھی دنیا کے مختلف حصوں میں منتشر طور پر پھیلے ہوئے تھے۔ مگر ان کا قوی ترین جتھا فلسطین میں تھا۔ جو اسی روم کا ایک صوبہ تھا۔ جب سے دنیا قائم ہوئی۔ آج تک اس سے زیادہ بدنصیب دوسری قوم صفحہ ارض پر نہیں پیدا ہوئی۔ انھیں ہدایت کے لئے الواح توراۃ ملیں۔ کھانے کے لئے آسمان سے من و سلویٰ نازل ہوا۔ پینے کے لئے پتھر

کی چھاتی سے چشمے اُبلے۔ عصائے کلیم ان کا حامی بنا۔ ید بیضا ان کے تاریک قلوب کو روشن کرنے کے لئے چمکا لیکن بایں ہمہ ان بدبختانِ ازل کے حصے میں خدا کی لعنت اور غضب کا طوق ہی رہا۔

تعلیماتِ موسوی کو پس پشت ڈال کر دین میں ہزاروں اختراعات کیں۔ حدود الٰہیہ میں تعدیاں کیں فرعون اور نمرود سالہ کی خدائی سے نجات پانے کے بعد عزیر کو خدا کا بیٹا بنا لیا۔ انبیاء کرام کا خون بے دریغ بہایا، خوں ریزیوں در زدگیوں فرقہ بندیوں میں ہمیشہ منہمک رہے اپنے عیسائی دشمنوں کو آگ میں زندہ جلانے سے بھی نہیں چوکتے۔ عیسائیوں کے قتل کے شوق میں مجوسیوں کی فوج میں بھرتی ہو کر لاکھوں عیسائیوں کو تہ تیغ کیا۔ سود خوری، قمار بازاری، زراندوزی افترا پردازی، کذب گوئی، بخل، حرص، بزدلی، اوہام پرستی، جادوگری ان کا طرۂ امتیاز بن چکا تھا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ جس قوم کے آباء و اجداد نے جالوت اور عمالقہ کے نخوت و غرور کو پیوندِ خاک کیا تھا وہ کبھی بخت نصر کے ہاتھوں پامال ہوئی کبھی خردوش کے ہاتھوں انتقام ربانی کا نشانہ بنی۔ اور آخر میں رومیوں نے ان کے عظمت و وقار کے بچے کھچے نشان کو بھی ملیا میٹ کر کے انھیں ذلت و رسوائی کے ساتھ دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دیا۔ جب کہ ان کی قبلہ گاہ سب سے مقدس معبد "ہیکل سلیمانی" کو کھدوا کر اس کو کوڑا کرکٹ پھینکنے کی جگہ بنا دیا۔

ھنود

یہ مذہب آج کی طرح اس وقت بھی ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلا ہوا تھا۔ جس کتاب کو یہ الہامی مانتے ہیں اس کا نام وید ہے۔ یہ چار ہیں رگ وید، شام وید، اتھروید، یجروید۔ اس مذہب کو اپنی قدامت پر بہت ناز ہے لیکن اگر مذہب کا کمال قدامت نہیں بلکہ ملک و قوم کی اخلاقی روحانی، عمرانی، سیاسی، سماجی اصلاح ہے، تو ہر منصف بلا جھجھک کہنے پر مجبور ہے کہ اس مذہب کی جتنی تاریخ معلوم ہے

اس کی رو سے یہ مذہب اس جوہر سے ہمیشہ کورا رہا۔ شرک ابتدا ہی سے جزو ایمان رہا۔ اصنام پرستی مدتِ مدید سے چلی آرہی ہے۔ توہم پرستی بدشگونی اس کی خمیر میں داخل ہے۔ بعد میں ذات پات کی تفریق نے اس کی رہی سہی وقعت بھی کھو دی۔ برہمن اور اونچی ذات والوں کے مقابلہ میں شودروں کی وہ حیثیت بھی نہیں رہ گئی تھی جو حیوانات کی تھی۔ شودر عورت سے زنا کرنا کوئی جرم نہ تھا۔ لیکن اگر شودر کسی اونچی ذات والے کو چھولے تو اس کی سزا موت تھی۔ شودر اگر کسی اونچی ذات والے کو مارے تو اعضا کاٹ لئے جاتے۔ گالی دیتا تو زبان نکال لی جاتی۔ اگر اونچی ذات والے کو تعلیم دینے کا دعوی کرے تو کھولتے ہوئے تیل سے منہ بھون دیا جاتا۔ شراب نوشی، قمار بازی عام تھی تناسخ کے قائل تھے۔ تناسخ کے چکر سے روح کو نجات دینے کے لئے جسم کو طرح طرح کی ایذائیں دینا۔ آبادی چھوڑ کر جنگلوں کی جھاڑیوں، پہاڑیوں کے غاروں میں تپسیا کرنے کو انسانیت کا مقصدِ تخلیق جانتے تھے۔ چاند، سورج، زمین، درخت پتھر، دریا، حیوانات کی پرستش کرنا عبادت تھا۔ حد یہ کہ شیو، اور اس کی تقلید میں دوسرے مادرزاد ننگے رہنے والے سادھوؤں کے عضوِ تناسل کی بے محابا پوجا ہوتی تھی۔ بلکہ بعض بعض فرقے والے ننگی عورتوں اور عورتیں ننگے مرد کی پوجا کرتی تھیں۔ مردانہ و زنانہ اعضا کے اتصال کی ہیئت کذائیہ کی مورتی عام طور پر پوجی جاتی۔

عورتوں کو جوؤں میں ہار جاتے۔ ایک عورت کے کئی کئی شوہر ہوتے۔ "ستی" اور "جوہر" کی ظالمانہ رسم معیارِ غیرت و حمیت تھی۔ بعض تہواروں پر شراب کے نشہ کی سرمستی میں ماں، بیٹی، بہن اپنی پرائی جو بھی مل جاتی اس سے اپنے جذبۂ شہوانی کی تکمیل کرنا بڑے پن کا کام سمجھتے۔ عورتیں بیچی جاتیں۔ اونچی ذات والوں کے لئے الگ اور نیچی ذات والوں کے لئے الگ قوانین ہوتے۔ نیچی ذات والے تعلیم و تربیت، تمدن و عمران حتیٰ کہ دھرم و دھارمک

باتوں سے دور اور محروم رکھے جاتے۔ شودر وید سُن نہیں سکتے تھے اور اگر کوئی سن لے تو اس کے کان میں سیسہ پلانے کا حکم ہوتا۔ یہ وہ اصول تھے جن پر آریہ ورت کی راج نیت اور دھرم کی بنیادیں قائم تھیں۔

بُدھ

کپل وستو کا راج پاٹ چھوڑ کر گوتم بدھ آتما کی مکتی کی تلاش میں جنگلوں، پہاڑوں میں مارے مارے پھرے۔ اور جیسا کہ ان کا بیان ہے "گیا میں پیپل کے درخت کے نیچے دُرِ مقصود پا لیا۔ لیکن اپنے پیروؤں کے لئے کیا چھوڑا؟ بدھ مت کے سفینے اس سے خالی نظر آتے ہیں ممکن ہے انھوں نے کوئی ٹھوس تعلیم دنیا کو دی ہو لیکن ان کے بعد ان کے چیلوں میں اتنے زبردست اختلافات پیدا ہوئے کہ آج تک یہ معلوم کرنا ناممکن رہا کہ ان کی اصلی تعلیم کیا تھی۔ مشہور تو یہی ہے کہ انھوں نے قوم کو بت پرستی سے روکا تھا مگر آج کا بدھشٹ خود ان کے مجسمے کی پرستش کر رہا ہے۔

یورپ، افریقہ، چین جہاں نظر ڈالئے اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ کہیں کوئی تمدن نہیں اور اگر ہے تو ایسا کہ جس کی سفاکی سے درندے الامان الحفیظ پکاریں کہیں کوئی مذہب نہیں، اگر ہے تو ایسے خرافات کا مجموعہ کہ جنہیں سنکر انسانیت شرم سے پانی پانی ہو جائے، انسان نے اپنی خود غرضیوں بوالہوسیوں کو مذہب کا نام دے رکھا تھا۔ ہر قوم دوسری قوم کے خون کی پیاسی تھی۔ ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ سے برسر پیکار تھا۔ انسان کے دل سے انسان کی عظمت اٹھ چکی تھی۔ ہر شخص حُبِ جاہ، نفسی برتری کے لئے دوسرے سے دست بگریباں تھا۔ شرافت اعلیٰ اخلاق، باہمی ہمدردی، انسانیت کا درد، عصمت و عفت، تزکیہ نفس، خدا پرستی، مظلوموں بیکسوں کی یاوری، داد خواہی، فریاد رسی دنیا سے مٹ چکی تھی۔

عرب کی حالت

آفتاب رسالت جس افق سے طلوع ہونے والا تھا، خود وہ دنیا کے دوسرے خطوں سے کم تاریک نہ تھا۔ خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے وادیِ غیرذی زرع میں اپنے لخت جگر کو آباد کر کے بیت اللہ کی تعمیر تو اس لئے کی تھی کہ لوگ اس مرکز سے وابستہ رہ کر وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ کی عبادت کریں لیکن امتداد زمانہ سے بدعات کی اختراع ہوتی گئی اور رفتہ رفتہ یہ آندھی اتنی تیز ہوئی کہ ملت ابراہیمی کا چراغ گل ہو گیا۔ جس زمانہ میں آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پیدا ہوئے عرب میں مختلف مذاہب پھیلے ہوئے تھے۔

دہریت، شرک، یہودیت، مجوسیت، نصرانیت۔

دہریت کی بنیاد اس پر قائم ہے کہ خدا کا کوئی وجود نہیں۔ سارے انقلابات پر زمانہ اثرانداز ہے۔ نہ قیامت ہے نہ اعمال کی جزا وسزا ہے انھیں کے اعتقاد کی ان آیات میں حکایت ہے۔

وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ	ان لوگوں نے کہا دنیا کی زندگی کے سوا اور کوئی زندگی نہیں۔ از خود مرتے اور جیتے ہیں اور ہمیں مارنے والا زمانہ ہی ہے۔
(جاثیہ آیت ۲۴)	

کچھ خدا کے قائل تھے۔ لیکن قیامت کے منکر تھے۔ ان کے اعتقادات کی تقریر و تردید اس آیت میں مذکور ہے۔

قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْ اَنْشَاَهَا اَوَّلَ مَرَّةٍ	اس نے کہا۔ گلی ہوئی ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا۔ تم بتا دو وہی دوبارہ پھر زندہ کرے گا جس نے پہلی بار بنایا تھا۔

بعض خدا کے بھی قائل تھے اور قیامت کے بھی لیکن نبوت کے منکر تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انسان پیغمبر نہیں ہو سکتا۔ پیغمبر ہونے کے لئے فرشتہ ہونا ضروری ہے۔ ان کے اعتقاد کا ذکر اس آیت میں ہے۔

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ۔	ان لوگوں نے کہا یہ کیسا رسول ہے؟ جو کھاتا پیتا ہے اور بازاروں میں گھومتا ہے۔

اور فرمایا۔

قَالُوْا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا۔ (سورہ اسریٰ آیت ۹۴)	انہوں نے کہا کیا اللہ نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا۔

لیکن مذکورہ بالا اعتقادات رکھنے والے خال خال تھے۔ اکثر بت پرست تھے۔ یہ بت پرست خدا کے قائل تھے۔ بتوں کی پرستش کو خدا کی رضا کا ذریعہ جانتے تھے۔ قرآن کریم ان کے خیالات کو ان الفاظ میں نقل فرماتا ہے۔

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (زمر)	ہم بتوں کو صرف اس لئے پوجتے ہیں کہ وہ ہمیں خدا سے قریب کر دیں۔

عرب میں بت پرستی کی بنیاد ربیعہ بن حارثہ نے ڈالی تھی۔ جو عمرو بن لحی سے مشہور ہے۔ قبیلہ خزاعہ کا مورث اعلیٰ یہی ہے۔

پہلے گزر چکا کہ عمرو نے جرہم کو مکے سے نکال کر خود کعبے کا متولی بن بیٹھا تھا۔ ایک مرتبہ شام گیا۔ وہاں لوگوں کو بت پوجتے دیکھ کر پوچھا انھیں کس لئے پوجتے ہو۔ بت پرستوں نے بتایا۔ یہ ہماری حاجتیں پوری کرتے ہیں۔ دشمنوں پر فتح دیتے ہیں۔ قحط میں پانی برساتے ہیں۔ عمرو نے کہا۔ ایسا ہے

تو مجھے بھی کچھ بت دے دو۔ ان لوگوں نے چند بت دیئے جن میں ہبل نامی بت بھی تھا۔ عمرو نے ان بتوں کو کعبے کے ارد گرد نصب کر دیا۔

کعبے میں بتوں کی پرستش دیکھ کر تمام عرب اس وبا میں مبتلا ہو گئے۔

حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ عمرو بن لحی کی آنتیں آگ میں گھسیٹی جاتی ہیں۔ یہ بت پرستی کی بنیاد ڈالنے کی سزا ہے۔

تین سو ساٹھ بت کعبے میں نصب تھے جن میں حضرت ابراہیم حضرت اسمٰعیل علیہما الصلوٰۃ والسلام کے مجسمے بھی تھے۔ دور دراز سے حج کے لئے آنے والے افراد مکے سے پتھر لے جاتے اور انھیں کعبے کے بتوں کی شکل پر تراش تراش کر نصب کر لیتے اور انھیں پوجتے۔

ھُبَل

ان بتوں میں سب سے بڑا ہبل تھا۔ انسانی شکل کا تھا جسے سرخ پتھر تراش کر بنایا گیا تھا۔ کعبے کی چھت کے بیچوں بیچ نصب تھا۔ لڑائیوں میں قریش اس کی جے پکارتے، اس پر قربانیاں چڑھاتے حتیٰ کہ انسان کی بھی۔

ہبل کے آگے فال کے تیر رکھے ہوئے تھے جن سے کسی کام کے کرنے سے پہلے فال نکالا کرتے تھے۔ یہ خاص قریش کا بت تھا۔

مَنات

یہ سب سے قدیم بت تھا۔ قدید کے پاس مکے مدینے کے مابین مدینے سے سات میل کے فاصلے پر لب سمندر نصب تھا۔ یہ خزیمہ اور ہذیل کا مخصوص بت تھا لیکن قریش بھی اس کی پرستش کرتے تھے۔ مدینے کے باشندوں میں اوس وخزرج کو بھی اس سے عقیدت تھی۔ اسی پر قربانیاں چڑھاتے۔ حج کا احرام یہیں پر کھولتے۔

عزّیٰ

یہ بت خاص بنو غطفان کا تھا انھیں کے باغ میں عزیٰ نام درخت کے پاس نصب تھا۔ قریش بھی اسے پوجتے

تھے۔ نذریں چڑھاتے۔ قربانیاں کرتے تھے۔ برکت کیلئے اپنا نام عبدالعزیٰ رکھتے۔

لات

یہ بنو ثقیف کا خاص بت تھا۔ یہ طائف میں نصب تھا۔ طائف والے اسے کعبے کے برابر مانتے تھے۔ حجاج اس پر اپنے ستو گوندھا کرتے تھے۔ بنو ثقیف میں اسی نام کا ایک شخص مرگیا کسی نے اڑا دیا کہ وہ مرا نہیں ہے بلکہ اپنے ہم نام پتھر میں حلول کر گیا ہے اس بنا پر لوگ اسے پوجنے لگے۔ ثقیف کے علاوہ قریش اور کنانہ بھی اسکی پوجا کرتے تھے۔ اپنے زعم میں ان تینوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔ اور قیامت کے دن ان کی شفاعت کی امید کرتے تھے۔ طواف کے وقت ان کے نام کا ورد کیا کرتے تھے۔

اساف ونائلہ

یہ قریش کے خاص بت تھے۔ ان کے پاس قریش قربانیاں کیا کرتے تھے مشہور تھا کہ یہ دونوں پہلے زندہ انسان تھے۔ اساف مرد، نائلہ عورت تھی۔ ان دونوں نے حرم میں بدکاری کی۔ اسی کی سزا میں مسخ ہو کر پتھر ہو گئے۔ ان کے علاوہ وُدّ، سواع، یغوث، یعوق، نسر وغیرہ نامی گرامی بتوں میں تھے۔ چھوٹے چھوٹے قبیلے کے الگ الگ سینکڑوں بت تھے۔ بت پرستی کے اس عام تسلّط کے باوجود سب اس بات کے معتقد تھے۔ کہ ان سب سے بالاتر ایک اور ہستی ہے جو تمام عالم کی خالق حقیقی اور عالم کے تمام افراد پر متصرف ہے جو معبود اعظم ہونے کے ساتھ ساتھ قدرت و طاقت میں ان تمام معبودوں سے بڑھی ہوئی ہے۔ جسے وہ اپنی زبان میں اللہ کہتے تھے۔ ان کے اس عقیدے کو ان آیات میں بیان فرمایا گیا ہے۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ	اور اگر آپ ان کافروں سے پوچھیں کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا

وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ۔

کیا اور چاند و سورج کو کس نے تابعدار کیا۔ تو یقیناً وہ کہیں گے، اللہ، یہ کدھر بھٹکے جا رہے ہیں۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ

اور اگر تم ان سے پوچھو گے کہ آسمان سے کس نے پانی برسایا اور اس پانی سے زمین کو مردہ ہونے کے بعد زندہ کیا تو لوگ یقیناً کہیں گے، اللہ۔

وَاِذَا رَكِبُوْا فِى الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ

جب کشتی پر چڑھتے ہیں تو سچے دل سے خدا کو پکارتے ہیں، پھر جب خدا نجات دے کر خشکی کی طرف پہنچا دیتا ہے تو شرک کرنے لگتے ہیں۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر جب صلحنامہ لکھا جانے لگا آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا۔ لکھو ــــــــــــ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ قریش کے نمائندے سہیل بن عمرو نے یہ اعتراض کیا۔

اَمَّا الرَّحْمٰنُ فَوَاللّٰهِ مَا اَدْرِىْ مَا هُوَ وَلٰكِنِ اكْتُبْ بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ كَمَا كُنْتَ تَكْتُبُ۔

خدا کی قسم! رحمٰن کو ہم نہیں جانتے لیکن باسمک اللّٰھم لکھو، جیسا کہ لکھا کرتے تھے۔

دوسری روایت میں ہے ــــ میں رحمٰن و رحیم کو نہیں جانتا۔ باسمک اللّٰھم لکھو ــــــ سہیل بن عمرو کا اللہ کی قسم کھانا اور باسمک اللّٰھم لکھوانا اور اس کو رواج عام بتانا اس بات کی دلیل ہے کہ اہل عرب بتوں کی پرستش کے ساتھ ساتھ ایک معبود اعظم کے قائل تھے۔

• • • • • • •

ستارہ پرستی

بت پرستی کے علاوہ عرب کے بہت سے قبائل میں ستارہ پرستی بھی رائج تھی یمن کے باشندے حمیر آفتاب کو پوجتے تھے۔ بنو کنانہ ماہتاب پرست تھے۔ بنو حمیر "و بران" کو، قیس "شعریٰ" کو، اسد عطارد کو، لخم اور جذام مشتری کو پوجتے تھے۔

نصرانیت

یہ مذہب بھی عرب میں جگہ جگہ زمانہ دراز سے پھیلا ہوا تھا چنانچہ قبائل عرب میں ربیعہ، غسان، لخم، جذام، بہرا، بلیٰ، قیس تغلب۔ یہ سب عیسائی قبائل تھے۔ قضاعہ کے بھی کچھ افراد اس سے متاثر تھے، نجران کا پورا علاقہ نصرانی تھا۔ خود مکہ معظمہ میں ورقہ بن نوفل زبردست عیسائی عالم موجود تھے۔ ان کے علاوہ بھی متعدد اشخاص نے شام جاکر انجیل کی تعلیم حاصل کی تھی۔ عبیداللہ بن جحش، عثمان بن حارث بھی عیسائی تھے۔

یہودیت

خیبر کی پوری آبادی یہودی تھی۔ حمیر، کنانہ، بنی حارث بن کعب، کندہ تمام قبائل یہودی تھے۔ مدینہ طیبہ میں قریظہ، بنی نضیر، بنی قینقاع یہودی تھے۔ اقتصادی حیثیت سے پورے مدینہ طیبہ پر ان کا قبضہ تھا۔ عرب کا مشہور شاعر سموال بن عادیا جس کی وفاداری اب تک ضرب المثل ہے یہودی تھا۔

یہودیت اور نصرانیت کی بنا پر اہل کتاب کی مرویات پورے عرب میں پھیلی ہوئی تھیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں بنی اسرائیل کے قصص جب مذکور ہوئے تو مشرکین نے یہ گمانِ فاسد کیا کہ انھیں کوئی یہودی یا عیسائی سکھاتا ہے۔

مجوسیت

ایران، عرب کا پڑوسی ملک تھا۔ پورا ایران آتش پرست تھا۔ اس کے اثر سے کہیں کہیں عرب میں بھی

آتش پرستی پائی جاتی تھی۔ قبیلہ تمیم مجوسی تھا۔ اسی وجہ سے اس قبیلے کے رئیس نے جس کا نام زرارہ تھا اپنی بیٹی سے شادی کر لی تھی۔
اپنی بیٹی سے شادی کرنا عرب کی غیرت کے منافی تھا۔ اس لئے بعد میں اس پر نادم ہوا۔ اقرع بن حابس رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو بعد میں مسلمان ہوئے پہلے مجوسی تھے۔

اخلاقی حالت

اخلاقی حیثیت سے اہل عرب کی اکثریت بہت گری ہوئی تھی۔ ڈاکہ زنی، چوری، غارت گری، بے حیائی، شراب نوشی، قمار بازی، زناکاری، دختر کشی، سفاکی، بیرحمی، درندگی، بہیمیت، سود خوری، دجل و فریب، ان کی گھٹی میں پلا دی گئی تھی عوام تو عوام بڑے بڑے سر برآوردہ رؤسا میں بھی یہ عیوب پائے جاتے تھے، پھر بھی وہ ریاست کی مسند پر بیٹھے ہوئے تھے۔ جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

دین حنیف

کفر و معصیت کی اس گھنگھور گھٹا میں کچھ سلیم الطبع افراد بھی تھے، ان کے دلوں میں اس طوفان بد تمیزی کے خلاف شدید نفرت کا جذبہ تھا۔ جن میں ورقہ بن نوفل، زید بن عمرو بن نفیل، عثمان بن حویرث، عبیداللہ بن جحش کا نام تاریخوں میں مذکور ہے۔ یہ سب قریش کے معزز افراد میں سے تھے، ——— ورقہ بن نوفل ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے چچا کے لڑکے تھے۔ ——— زید بن عمرو بن نفیل حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے چچا تھے۔ عبیداللہ بن جحش حضرت حمزہ کے بھانجے تھے۔ عثمان بن حویرث عبدالعزیٰ کے پوتے تھے۔
یہ لوگ ایک بار کسی میلے میں تھے۔ بتوں کی پوجا دیکھ کر دل میں خیال آیا کہ یہ کیا لغویت ہے کہ ہم ایک پتھر کو سجدہ کرتے ہیں۔ جو نہ دیکھتا ہے نہ سنتا ہے، نہ نقصان پہنچا سکتا ہے نہ فائدہ۔ اس خیال کے آتے ہی

بت پرستی چھوڑ کر دین حق کی تلاش میں نکل پڑے۔

زید دین حق کی جستجو میں شام پہنچے۔ یہودیوں کے ایک حبر سے ملے۔ اس سے اس کے دین کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہونے کے بعد کہا۔ ہوسکتا ہے کہ میں تمہارا دین قبول کرلوں۔ اس یہودی حبر نے کہا۔ اگر خدا کا غضب مول لینا چاہتے ہو تو ہمارا دین اختیار کرو۔ زید نے کہا کہ میں خدا کے غضب ہی سے تو بھاگا ہوں۔ حتی الوسع خدا کے غضب کو مول نہیں لے سکتا۔ کوئی دوسرا دین بتاؤ۔ اس نے کہا یہ دین صرف دین حنیف دین ابراہیم ہے۔ وہ نہ یہودی تھے نہ نصرانی۔ وہ صرف اللہ کی عبادت کرتے تھے۔

اسکے بعد زید ایک عیسائی پادری سے ملے۔ وہاں بھی وہی گفتگو ہوئی۔ اس نے کہا۔ اگر خدا کی لعنت چاہتے ہو تو نصرانیت اختیار کرلو انھوں نے جواب دیا۔ خدا کی لعنت سے بچنے کے لئے ہی تو بھاگ رہا ہوں۔ اچھا کوئی اور دین بتاؤ۔ اس نے بھی یہی کہا۔ دین حنیف دین ابراہیم کو اختیار کرو۔

جب یہودی نصرانی پادریوں سے دین حنیف کا پتہ پاچکے تو شام سے واپس آئے اور دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔ اے اللہ۔ میں تجھے گواہ بناتا ہوں کہ میں ملت ابراہیم پر ہوں۔

اسی طرح ایک مرتبہ کعبے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ تب قریش سے مخاطب ہوکر کہا۔ میرے سوا تم میں کوئی دین ابراہیم پر نہیں [1]

وہ کہا کرتے تھے۔ میرا معبود ابراہیم کا معبود ہے۔ میرا دین ابراہیم کا دین ہے [2] اور کہا کرتے تھے۔ اے اللہ اگر میں جانتا کہ تو موجودات

---

[1] بخاری باب حدیث زید بن عمرو بن نفیل [2] عمدۃ القاری ص ۳۷ ج ۸

یں کسی ہستی کی عبادت پسند کرتا ہے تو میں ضرور اس کی پرستش کرتا۔
یہ ہتھیلیوں پر سجدے کیا کرتے۔ بتوں کے نام پر جانور ذبح کرنا عرب میں عام تھا۔ زید نہ بتوں کے نام جانور ذبح کرتے اور نہ بتوں کے نام پر ذبح کیا ہوا جانور کا گوشت کھاتے۔

قبل بعثت ایک بار مقام بلدہ پر حضور پُر نور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ان کی ملاقات ہوئی۔ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سامنے کھانا لایا گیا۔ حضور نے ان کو بھی بلایا۔ زید نے انکار کر دیا اور کہا میں بتوں کے نام کا ذبیحہ نہیں کھاتا۔

جب کسی شقی کو دیکھتے کہ وہ اپنی بچی کو زندہ درگور کرنے کے لئے لے جارہا ہے تو اس سے لے لیتے، اس کی پرورش کرتے۔ جب وہ ہاتھ پاؤں کی ہو جاتی اس کے باپ سے کہتے۔ چاہو تو اپنی بچی لے جاؤ چاہو تو میرے پاس ہی رہنے دو۔

آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بعثت سے پانچ سال قبل جس سال کعبہ کی تعمیر ہوئی تھی۔ ان کا انتقال ہو گیا۔ حرا کے نیچے دفن کئے گئے۔ ابن سعد نے عامر بن ربیعہ سے نقل کیا ہے۔ کہ زید نے ہمیں بتایا تھا کہ میں قوم کے خلاف ملت ابراہیم و اسمٰعیل کا متبع ہوں۔ مجھے بنی اسمٰعیل میں سے ایک نبی کا انتظار ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ میں ان سے مل نہ سکوں گا لیکن ان کی تصدیق کرتا ہوں اور ان پر ایمان لاتا ہوں۔ اور گواہی دیتا ہوں کہ وہ یقیناً نبی ہیں۔ اگر تمھاری زندگی وفا کرے اور ان سے تم کو شرف ملاقات حاصل ہو تو ان سے میرا اسلام کہہ دینا ——— عامر بن ربیعہ نے آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے جب یہ ذکر کیا تو حضور نے سلام کا جواب دیا۔ اور فرمایا اللہ ان پر رحم کرے میں نے جنت میں انھیں دامن گھسیٹتے ہوئے دیکھا ہے۔

دوسری حدیث میں ہے کہ آنحضور نے یہ فرمایا کہ جنت میں ان کے لئے دو درجے ہیں ـــــ دوسری حدیث میں ہے کہ آنحضور نے فرمایا کہ قیامت کے دن وہ ایک مستقل امت ہوں گے۔

ورقہ، عبیداللہ بن جحش، عثمان بن حویرث عیسائی ہو گئے تھے۔ ان میں ورقہ بن نوفل کے بارے میں حدیث میں مذکور ہے۔ حضرت ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کیا یا رسول اللہ! ورقہ نے آپ کی تصدیق کی تھی لیکن اعلان نبوت سے پہلے ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں نے انھیں جنت میں سفید لباس پہنے ہوئے دیکھا ہے۔ اگر وہ اہل نار سے ہوتے تو کوئی اور لباس ہوتا۔

اسی بنا پر بعض علما نے انھیں صحابہ میں شمار کیا ہے۔ اور اول المسلمین انھیں کو کہا ہے۔

عبیداللہ بن جحش نے بعثت کا زمانہ پایا۔ پہلے ایمان لایا اپنے خاندان کے ساتھ حبشہ ہجرت کر کے گیا۔ پھر مرتد ہو کر عیسائی ہو گیا۔ اور عیسائیت ہی پر مرا۔

قس بن ساعدہ

ان کے علاوہ موحدین جاہلیت میں قس بن ساعدہ الایادی کا نام بہت نمایاں طور پر ملتا ہے۔

انہوں نے بازار عکاظ میں آنحضور کی آمد آمد کے سلسلے میں وہ مشہور خطبہ دیا، جو شعر و ادب کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔ اس وقت آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی موجود تھے۔ اس کا ایک جز یہ ہے۔

نبیاً قد حان حینه وانی لکم اوانه فطوبی لمن امن به فهداه وویل لمن خالفه وعصاه۔

ایک نبی کی آمد کا زمانہ قریب آگیا ہے مبارکباد ہے اسے جو ان پر ایمان لایا اور انھوں نے اسے راہ حق دکھائی اور بربادی ہے اس کے لئے جس نے اس کی مخالفت اور نافرمانی کی۔

امیہ بن صلت

اسی طرح امیہ بن صلت نے بھی بت پرستی چھوڑ دی تھی اور اس کے خلاف بہت سے اشعار کہے ہیں۔ جو اس کے دیوان میں آج تک موجود ہیں

اصابہ میں ہے کہ امیہ نے آسمانی کتابیں پڑھی تھیں جس سے متاثر ہو کر بت پرستی چھوڑ کر دین حنیف قبول کر لیا تھا۔ یہ غزوۂ بدر تک زندہ رہا۔ طائف کا رئیس تھا۔ ہندہ کے باپ عتبہ کا ماموں زاد بھائی تھا۔ عتبہ جب بدر میں مارا گیا تو امیہ نے اس پر ایک مرثیہ لکھا۔ ہو سکتا ہے اسی تعصب نے اسے ایمان سے محروم رکھا ہو۔ یہ حالت کفر میں مرا۔

ان کے علاوہ اور بہت سے لوگ تھے۔ جن کی عقلوں نے اس ہمہ گیر تاریکی میں بھی توحید کی طرف رہنمائی کی۔

چھٹی صدی عیسوی میں آباد دنیا کی مشرکانہ رسوم، سفاکانہ نظام حکومت، بہیمانہ تمدن، ننگ انسانیت مذہبی تقریبات پکار پکار کر کیا یہ نہیں کہہ رہے تھے، ضرورت ہے اور اشد ضرورت ہے کہ اب وہ ہستی تشریف لائے، جس کے ہاتھوں میں حضرت خلیل اللہ کا بت شکن تبر ہو، موسیٰ کا عصائے غضب و جلال ہو جس کے مظہر قدرت ہاتھوں میں یوشع کی تلوار ہو جس کے خزانے میں حضرت عیسیٰ کی کیمیائی ہو جس کے صحیفۂ قدس میں عرش کو ہلا دینے والی مناجاتیں ہو۔ مملکتِ سلیمان جس کے رکاب میں ہو۔ یحییٰ و زکریا کا ضبط و تحمل جس کا خلق عظیم ہو۔

بعثت

غارِ حرا

نبوت کسبی چیز نہیں بلکہ یہ عطیۂ ربانی ہے۔ اپنے فضل سے وہ جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ۔ یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔

اس کے باوجود وہ جسے دینا چاہتا ہے اس کے اندر اول روز ہی سے وہ جوہر ودیعت کر دیتا ہے۔ جس کے سہارے وہ اس بارِ گراں کو اٹھالیتا ہے۔

آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جس دورِ جہالت میں پیدا ہوئے تھے اس کا ایک خاکہ اوپر گزر چکا ـــــ جس طوفان میں ساری دنیا بہی جا رہی تھی اس میں کسی بھی انسان کا بہ جانا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔

لیکن آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی قبل بعثت کی زندگی پڑھئے آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کبھی بھی رسوم جاہلیت میں کوئی حصہ نہیں لیا نہ کبھی بتوں کو سجدہ کیا نہ شراب پی، نہ قمار بازی کی، نہ فواحش کے قریب گئے۔

عرب میں افسانہ گوئی کا رواج عام تھا۔ ہر کہ ومہ اس میں شریک ہوتا ایک بار آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی افسانہ سننے کے ارادے سے گھر سے چلے۔ لیکن راستے میں ایک جگہ شادی ہو رہی تھی، اسے دیکھنے کے لئے کھڑے ہوئے وہیں نیند آگئی اور صبح تک وہیں سوتے رہے۔

راست بازی، دیانت داری کے بارے میں گزر چکا کہ ساری قوم آپ کو امین کہہ کر پکارتی تھی، یہ سب کچھ اسی لئے تھا کہ قدرت کو ایک دین محکم اور شریعت غرا کی تعمیر کرانی تھی، اس کے لئے ایسے مقدس اور ستھرے ہاتھوں کی ضرورت تھی جو ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک ہوں جس کے قوائے قدسیہ اس قادر قیوم کی حفاظت میں ہوں جو ہر غالب سے بڑھ کر غالب ہے۔

ایک انسان جو بال بچے والا ہو، دینوی کاروبار میں پھنسا ہو، اس کو نور ایزدی کا پتہ چلا لینا آسان نہیں، وہ بھی اس حال میں جب کہ گھٹا ٹوپ اندھیری پوری دنیا پر چھائی ہوئی ہو۔ لیکن بایں ہمہ قدرت کو جب کسی سے کام لینا ہوتا ہے تو لے لیتی ہے۔

مکہ معظمہ سے منیٰ جاتے ہوئے تین میل کے فاصلے پر بائیں ہاتھ جبل نور ہے۔ اسی کی چوٹی پر ایک غار ہے۔ جس کا نام ہے غار حرا۔ پہاڑ کی دو چٹانوں پر ایک چٹان چڑھی ہوئی ہے۔ جس سے یہ غار بن گیا ہے۔ پورب جانب دروازہ ہے، دروازہ کے باہر تھوڑا سا صحن ہے۔ صحن کے اتر جانب انتہائی گہری کھائیاں ہیں۔ جن میں ہرے بھرے درخت رہتے ہیں۔ اور دکھن اور پورب جانب پہاڑ ہیں۔ بہت پر فضا مقام ہے۔ وہاں پہنچتے ہی طبیعت میں نشاط پیدا ہو جاتا ہے۔ اس غار میں اتنی جگہ ہے کہ ایک شخص کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکتا ہے اور ایک شخص بیٹھ کر اور ایک آدمی آرام سے سو سکتا ہے۔

غار کے شمالی، مغربی گوشے میں ایک دراڑ ہے، اتنی کشادہ کہ کروٹ سے آدمی آجا سکتا ہے۔ اس دراڑ سے غار کے اندر بہت خوشگوار ہوائیں آتی رہتی ہیں۔ اور کچھ روشنی بھی۔ غار میں شمال کی طرف بیٹھ کر دیکھنے سے کعبہ مقدس نظر آتا ہے۔

اسی کو غارِ حرا کہتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قبل بعثت اسی غارِ حرا میں جا کر ایک ایک مہینے تک خلوت گزیں رہتے۔ اپنے طور پر اللہ عزوجل کی عبادت کرتے، اپنے ہمراہ کھانے پینے کا سامان لے جاتے۔ جب وہ ختم ہو جاتا تو واپس آکر پھر توشہ لے کر تشریف لے جاتے۔ کبھی کبھی ایک مہینہ تک قیام فرماتے۔ ایسی صورت میں ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کھانے کا سامان پہنچا دیا کرتی تھیں۔

یہی سلسلہ جاری تھا کہ ایک دن حضرت جبرئیل امین حاضر ہوئے اور حضور سے عرض کیا "پڑھئے" آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا "میں نہیں پڑھتا"۔ جبرئیل امین نے آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو سینے سے لگا کر طاقت بھر دبوچا۔ پھر چھوڑ دیا۔ اور عرض کیا "پڑھئے" آں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اب کی بار بھی فرمایا! "میں نہیں پڑھتا"۔ یہ سنکر جبرئیل امین نے دوبارہ سینے سے لگا کر طاقت بھر دبوچا۔ اور علیحدہ کر کے کہا "پڑھئے"، آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا "میں نہیں پڑھتا"۔

اس کے بعد تیسری بار جبرئیل امین نے سینے سے لگا کر پھر طاقت بھر دبوچا اور علیحدہ کر کے عرض کیا۔

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ۔	پڑھئے اپنے رب کے نام سے جس نے انسان کو منجمد خون سے پیدا فرمایا۔ پڑھئے اور آپ کا رب بہت کرم والا ہے جس نے قلم سے علم سکھایا اور انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

اب حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اسے پڑھا۔ اس کے بعد جبرئیل امین واپس چلے گئے۔

بعض روایتوں میں ہے کہ جبرئیل امین نے زمین پر پاؤں سے ٹھوکر ماری جس سے پانی کا چشمہ ابل پڑا۔ وضو کیا اور دو رکعت حضور کو نماز پڑھائی۔ اور چلے گئے۔

نزول وحی کی وجہ سے حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے جسم اقدس پر شدید لرزہ طاری ہوگیا۔ یہاں تک کہ دونوں شانوں کے درمیان کا گوشت بھی کانپنے لگا۔ اسی حال میں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پہاڑ سے نیچے اترے۔ اور گھر تشریف لائے اور گھر والوں سے کہا مجھے کمبل اڑھاؤ، مجھے کمبل اڑھاؤ۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کمبل اڑھا دیا گیا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ جسم پر ٹھنڈا پانی ڈالنے کے لئے فرمایا۔ لوگوں نے ٹھنڈا پانی ڈالا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب سکون حاصل ہوا تو ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ کو پورا واقعہ سنایا اور فرمایا! مجھے اپنی جان کا ڈر ہے۔ اس پر حضرت خدیجۃ الکبریٰ نے عرض کیا۔ ہرگز نہیں۔ بخدا اللہ آپ کو رسوا نہ فرمائے گا۔ آپ صلۂ رحمی کرتے ہیں۔ اور بے سہارا کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ اور نادار کو کما کر دیتے ہیں، اور مہمان داری کرتے ہیں۔ اور راہِ حق میں در پیش آنے والی مصیبتوں پر لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔

اس کے بعد حضرت خدیجہ حضور کو لے کر اپنے چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل بن اسد کے پاس لائیں۔ یہ جاہلیت میں نصرانی ہوچکے تھے۔ عبرانی خط جانتے تھے۔ انجیل کو عبرانی میں لکھتے تھے۔ بہت بوڑھے نابینا ہوچکے تھے۔ حضرت خدیجہ نے ان سے کہا اے میرے چچا کے بیٹے۔ اپنے بھتیجے کی بات سنئے۔ ورقہ نے حضور سے پوچھا اے بھتیجے تم کیا دیکھتے ہو! رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا تھا بتایا۔ وہ سب سنکر ورقہ نے کہا۔ یہ وہ ناموس ہیں جو موسیٰ پر اترتے تھے۔ کاش اس وقت میں جوان

ہوتا۔ زندہ ہوتا۔ جب تمھاری قوم تم کو نکالے گی۔ تو آپ کی بھرپور مدد کرتا۔
حضور نے ورقہ سے پوچھا کیا میری قوم مجھ کو وطن سے نکالے گی۔ ورقہ نے کہا کہ ہاں۔ جو تم لائے ہو۔ جو بھی وہ اس کی مثل لے کر آیا۔ تو اس کی قوم نے اس کے ساتھ یہی معاملہ کیا، اس کے کچھ ہی دنوں بعد ورقہ کا انتقال ہو گیا۔
اس کے بعد تین سال تک وحی کا سلسلہ بند رہا۔
غارِ حرا میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کس طرح عبادت کرتے تھے۔
عبادت صرف غور وفکر اور مراقبہ تھا۔ یا قول وفعل سے بھی تھی علما کے دونوں قول ہیں۔ راجح یہ ہے کہ دونوں طرح عبادت تھی۔
غور وفکر، مراقبہ بھی کرتے تھے۔ اور کچھ پڑھتے بھی تھے۔ کچھ ارکان بھی ادا کرتے تھے۔ اور یہ عبادت کسی شریعت کی اتباع میں نہیں تھی۔ کسی سے سیکھ کر نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اللہ عزوجل آپ کے دل میں جس طرح ڈالتا اس طرح کرتے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ واقع میں ملت ابراہیمی کے مطابق تھی۔
عام طور پر "مَا اَنَا بِقَارِیٍٔ" کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ میں پڑھا ہوا نہیں یہ ترجمہ بھی غلط نہیں۔ مراد یہ ہے کہ رسمی طور پر بظاہر میں پڑھا ہوا نہیں لیکن عرب کے محاورے اور یہاں کی حالت کے مطابق یہی ترجمہ بہتر ہے۔ جو میں نے کیا یعنی "میں نہیں پڑھتا"
نحو کی کتابوں میں لکھا ہے کہ جب اسم فاعل کے شروع میں "ما نافیہ ہوتا ہے تو حال یا استقبال کے معنی میں ہوتا ہے۔
چونکہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس وقت استغراقی کیفیت میں تھے۔ ذات باری تعالیٰ اس کے صفات کے مشاہدے میں مستغرق تھے۔ دنیا وما فیہا سے بے تعلق، اس عالم میں جب جبرئیل امین نے کہا پڑھئے! تو اس شہودی کیفیت میں جو لذت و وارفتگی تھی۔ اور پڑھنے میں اس میں خلل

واقع ہوتا۔ اس لئے فرمایا " میں نہیں پڑھتا۔

حدیث میں یہ کلمات وارد ہیں۔

فَاَخَذَنِیْ فَغَطَّنِیْ حَتّٰی بَلَغَ مِنِّی الْجَهْدُ جبرئیل نے مجھے پکڑا اور طاقت بھر دبوچا

میں نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے۔ کہ جبرئیل نے مجھے پکڑا اور طاقت بھر دبوچا۔ اس ترجمے کو بہت سے معاندین نے کہا ہے کہ غلط ہے۔ یہ ان کی خام کاری ہے۔

"جَهْدُ" جیم کے فتحہ کے ساتھ بھی ہے اور ضمہ کے ساتھ بھی۔ اسکے معنی یہاں مشقت یا طاقت ہے اور یہ بَلَغَ کا فاعل بھی ہوسکتا ہے اور مفعول بہ بھی۔ جس کی پوری تفصیل نزہتہ القاری جلد اول میں مذکور ہے جب اس کو بلغ کا فاعل بنا دیں گے تو بَلَغَ کا مفعول محذوف مبلغہ ہوگا۔ اب ترجمہ یہ ہوگا۔ فرشتے نے مجھے دبوچا یہاں تک کہ میری طاقت اپنے حد کو پہنچ گئی۔ اور جب اَلْجَهْدَ کو منصوب پڑھیں گے یہ بلغ کا مفعول بہ ہوگا اور بلغ کا فاعل ضمیر مستتر ہوگی۔ جس کا مرجع "غَطّ" ہے۔ جس پر "غَطَّنِیْ" دلالت کرتا ہے۔ اب معنی یہ ہوں گے۔

" فرشتے نے مجھ کو دبوچا یہاں تک کہ اس کا دبوچنا میری غایت کو پہنچ گیا۔"

ان دونوں کا حاصل یہ ہوا کہ فرشتے نے مجھے میری طاقت بھر دبوچا۔

لیکن یہاں ایک توجیہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ منی کے "من" کو تعلیل کے لئے لیں اور چونکہ نفس ذات کسی چیز کی علت نہیں ہوسکتی۔ اس لئے غَطّ مضاف محذوف ہوگا یعنی "لاجل غطی"۔ "الجهد" پر الف لام عہد کا مانو۔ اس سے مراد جہد ملک ہو ________

اب اَلْجَهْدُ کے ضمے کی روایت کا معنی یہ ہوا۔ میرے دبوچنے کی وجہ سے فرشتے کی طاقت اپنے حد کو پہنچ گئی۔

اور دوسری روایت کی بناپر جب "اَلْجَهْدَ" کو بلغ کا مفعول بہ مانیں گے، تو بلغ کی ضمیر مستتر فاعل کا مرجع "ملک" ہوگا۔ اب معنی یہ ہوا۔

میرے دبوچنے کی وجہ سے فرشتہ اپنی طاقت کی انتہا کو پہنچ گیا۔

ان دونوں کا حاصل یہ نکلا فرشتے نے اپنی قوت بھر مجھے دبوچا" میں نے ان چاروں احتمالوں کا لحاظ کر کے اختصار وجامعیت کے ساتھ ترجمہ یہ کیا۔

"طاقت بھر دبوچا"

یہاں طاقت عام ہے، خواہ حضور کی طاقت ہو خواہ جبرئیل کی دونوں کو شامل ہے۔

ہر ایماندار جانتا ہے کہ یہ دوسرے اخیر کے دو معنی حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عظمت شان کے کتنے مناسب ہیں۔

اس دبوچنے کی حکمت ہی تھی کہ آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی استغراقی کیفیت کو فرو کیا جائے۔ اگر کوئی شخص پورے انہماک سے کسی طرف متوجہ ہو اور اس سے کچھ کہا جائے وہ نہ سنے تو اس کا طریقہ یہی ہے کہ اسے جھنجھوڑا جاتا ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جس استغراقی کیفیت میں تھے۔ اسے فرو کرنے کے لئے جبرئیل امین نے تین بار دبوچا۔ ورنہ اس دبوچنے کی کیا توجیہ ہوسکتی ہے۔ اور یہ کہنا کہ جبرئیل نے فیض پہنچانے کے لئے دبوچا تھا توجیہ بارد ہے۔

فہرست مضامین

فقیہ الہند شارح بخاری مدظلہ العالی کی اہم تصانیف

نزہۃ القاری

اصح کتب بعد کتاب اللہ بخاری شریف کی نہایت جامع مفید شرح جو تمام عربی فارسی شروح کا عطر مجموعہ ہے۔ عوام، خواص، علماء، طلبہ، واعظین، مستفیدین کے لئے لاجواب تحفہ۔ کتابت طباعت نہایت اعلیٰ جلد زریں، خوب صورت، مضبوط، خوشنما۔ سائز ۲۰×۳۰/۸

جلد		صفحات	از		تا
جلد اول	صفحات	۵۵۹	از ابتداء	تا	کتاب الوضوء
″ ثانی	″	۴۸۸	از کتاب الوضوء	تا	ختم کتاب الصلوٰۃ
″ ثالث	″	۵۵۶	از مواقیت الصلوٰۃ	تا	جنائز
″ رابع	″	۵۲۰	از کتاب الجنائز	تا	کتاب المناسک
″ خامس	″	۵۲۸	از کتاب الصوم	تا	کتاب الھبہ
″ سادس	″	۶۱۸	از کتاب الشہادۃ	تا	کتاب الانبیاء
″ سابع	″	۶۴۸	از کتاب المناقب	تا	کتاب التفسیر
″ ثامن	″	۴۱۶	از کتاب فضائل القرآن	تا	کتاب الدعوات
″ تاسع	″	۳۵۶	از کتاب الرقاق	تا	ختم بخاری

اشرف السیر

فن سیرت پر تحقیقی مقدمے کے ساتھ غار حرا تک کے واقعات پر مشتمل ایک تاریخی دستاویز۔ صفحات قیمت

مقالات شارح بخاری

شارح بخاری کے اہم موضوع پر مضامین و مقالات کا حسین گلدستہ۔ تین حصوں میں۔ سائز ۳۶×۲۳/۱۶

اسلام اور چاند کا سفر

از روئے شرع چاند پر پہنچنا ممکن ہے یا نہیں؟ چاند سورج ستارے کہاں ہیں۔ شارح بخاری کی تحقیقات کا خزینہ۔ سائز ۳۰×۲۰/۱۶ صفحات ۱۲۸ قیمت۔

اثبات ایصال ثواب

اس موضوع پر شارح بخاری نے اس کتاب میں ایک نئے انداز سے بحث کی ہے میلاد و قیام نیاز و فاتحہ کے سلسلہ میں جو لوگ کسی شک و شبہے میں ہوں ان کے اطمینان کلی کی دستاویز۔ سائز ۳۶×۲۳/۱۶ صفحات ۸۰ قیمت

فتنوں کی سرزمین

نجد و عراق کا ایک گراں قدر تاریخی دینی اور سیاسی جائزہ۔

امام احمد رضا اور مسئلہ تکفیر

از شارح بخاری۔ اپنے موضوع پر علم و تحقیق کا قابل مطالعہ ذخیرہ

منصفانہ جائزہ

سنی و دیوبندی اختلافات پر شارح بخاری کی فیصلہ کن ابحاث کا مرقع۔ سائز ۳۶×۲۳/۱۶

تحقیقات

معاندین اہلسنت کے کچھ اعتراضات کے مدلل جوابات۔ دو حصوں میں۔ سائز ۳۶×۲۳/۱۶

اذان خطبہ کہاں ہو

اس موضوع پر شارح بخاری کے تلمیذ رشید مولانا حافظ عبد الحق صاحب کا محققانہ رسالہ۔ اذان خطبہ کہاں ہو، پر پھلواری کے بعض پیروں کی بہت زہر ریزی تھی۔ اس کا بھرپور رد اس کتاب میں ہے۔ سائز ۳۶×۲۳/۱۶

تنقید برمحل

جناب مولانا حافظ عبد الحق صاحب زیدہ مجدہ کے اشہب قلم کی جولانی دماغ کی نکتہ آفرینی مطالعہ کی فراوانی کا منظر دیکھنا ہو تو اس کا ضرور مطالعہ کریں۔ سائز ۳۶×۲۳/۱۶

شارح بخاری

از:- مولانا یٰسین اختر مصباحی۔ مولانا موصوف کے باوقار اور جاندار قلم سے شارح بخاری حضرت علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی دام ظلہ کے حالات زندگی، خدمات پر مشتمل ایک مختصر اور جامع تعارف۔ صفحات ۲۰۵- سائز ۳۶×۲۳/۱۶

دائرۃ البرکات، کریم الدین پور، قصبہ گھوسی، ضلع مئو (یوپی، انڈیا)